تغزل جو شاعری کی جان ہے اُن کے کلام میں پوری رعنائیوں کے ساتھ جلوہ
گر ہوا اور لوگوں نے انکو بجا طور پر شہنشاہ متغزلین کے معزز لقب سے یاد کیا۔
ان کی اس حیثیت کو اردو کے تمام بڑے بڑے شعرا نے تسلیم کیا۔

ان الفاظ کے ساتھ اب آخر میں ڈاکٹر جمیل جالبی کا شکریہ ادا کرتا ہوں
کہ انہوں نے ایک ایسے اہم اور دلچسپ موضوع کو اپنے توسیعی خطبہ کے لئے منتخب
کرکے اس کے متعلق ایسا قیمتی مواد پیش کیا جس سے ہماری معلومات میں نہ صرف
گرانقدر اضافہ ہوا بلکہ میر کے تعلق سے بہت سے بالکل نئے گوشے بھی سامنے آ
میں تمام حاضرین کا بھی شکر گزار ہوں کہ وہ تعطیل کے دن اس خطبہ کو سماعت فرما
کے لئے یہاں تشریف لائے اور ان خطبات سے ہمارا جو مقصد ہے اس کو پورا کر
میں ہمارے ساتھ تعاون کیا۔

(اگست ۱۹۸۰ء)

پہلا

بابائے اُردو یادگار لیکچر

کراچی

۳۹ اگست ۱۹۸۰ء

از

ڈاکٹر جمیل جالبی

جناب صدر، خواتین و حضرات!

میں انجمن ترقی اردو پاکستان کے صدر اور معتمد دونوں کا شکر گزار ہوں جنہوں نے "بابائے اردو یادگار لیکچر" کے لئے مجھ حقیر فقیر کو دعوت دی۔ بابائے اردو یادگار لیکچر کا آغاز کر کے اور اس سلسلے کا یہ پہلا لیکچر ہے، انجمن ترقی اردو پاکستان نے ایک ایسے ماحول میں، جہاں سنجیدہ فکری، تخلیقی و ذہنی سرگرمیاں بجھ گئی ہیں اور اہل علم و ادب ناقدری کا شکار ہیں، ایک ایسا قدم اٹھایا ہے جو مثبت بھی ہے اور مفید بھی۔ آج صورتحال یہ ہے کہ ہمارے ہاں فکر و ذہن کے دروازے بند ہیں اور ان میں بڑے بڑے قفل پڑے ہیں۔ پھر ستم کی بات یہ ہے کہ اگر چند دیوانے اس کام میں لگے ہوئے ہیں تو معاشرے کے تعلیم یافتہ فرزانے اور ملک کے بظاہر دانشور، جنہیں آج کی اصطلاح میں سوڈو انٹیلیکچوئل کہا جاتا ہے، ایسے دیوانوں کا اس طرح اور اس لئے مذاق اڑاتے ہیں کہ یہ سرگرمیاں معاشرے کی نظر سے گر جائیں اور ان کی ذہنی سطح چھپی رہے۔ آج عام طور پر لوگ نہ کتابوں کی بات کرتے ہیں، نہ مسائل پر تبادلۂ خیال کرتے ہیں اور جب، دو مختلف سمتوں سے آنے جانے والی چیونٹیوں کی طرح، ذرا دیر کو ملتے ہیں تو بات اخبار یا ٹیلی وژن کے پروگراموں تک محدود رہتی ہے۔ ایک ایسے ماحول میں انجمن ترقی اردو نے "بابائے اردو یادگار لیکچر" کا آغاز کر کے سنجیدہ ذہنی و فکری سرگرمیوں کی جانب صحیح قدم اٹھایا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ سلسلہ سال بہ سال جاری رہے گا اور آئندہ سالوں میں لیکچر دینے والے

حضرات نہایت محنت سے اس روایت کو آگے بڑھائیں گے۔

بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق صاحب مرحوم و مغفور نے جس گہری سنجیدگی، محنت اور خلوص کے ساتھ اردو زبان و ادب کی خدمت انجام دی ہے وہ ہماری تاریخ کا ایک شاندار اور زرّیں باب ہے۔ بابائے اردو نے نہ صرف اردو زبان کو ایک نئی زندگی اور نیا رُخ دیا بلکہ اس میں تحقیق کی روایت قائم کرکے بند دروازوں کو بھی کھول دیا۔ اس وقت اردو زبان و ادب کے سلسلے میں جو کام ہو رہا ہے اس میں بابائے اردو کی روایتِ تحقیق شامل ہے۔ انہوں نے نہ صرف نوجوانوں کو اس اہم اور بنیادی کام پر لگایا بلکہ خود بھی نہایت محنت سے مختلف النوع موضوعات پر کتابیں اور مضامین لکھ کر ایسے سدا بہار پھول کھلائے جن کی مہک ہمیں معطر کر رہی ہے اور جن کی تازگی آج بھی اسی طرح باقی ہے۔ اگر بابائے اردو کو، جنہوں نے تقریباً ۶۵ سال تک اردو زبان و ادب کی خدمت انجام دی، اردو کی تاریخ سے ذرا دیر کو الگ کر دیا جائے تو ہم محسوس کریں گے کہ ایک بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے۔ انجمن ترقی اردو نے "بابائے اردو یادگار لیکچرز" کا آغاز کرکے نہ صرف بابائے اردو کی روایت کو آگے بڑھایا ہے بلکہ ان کی روح کو بھی حقیقی سکون مہیا کیا ہے۔

محمد تقی میر، جو آج کے لیکچر کا موضوع ہیں بابائے اردو کے محبوب شاعر تھے۔ آج سے تقریباً ساڑھے سات سال پہلے بابائے اردو نے ۱۹۳۱ء میں اپنے مبسوط مقدمے کے ساتھ "انتخابِ میر" کے نام سے کلیاتِ میر کا انتخاب شائع کیا جو اتنا مقبول ہوا کہ اب تک اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور یہ انتخاب برعظیم کی مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے۔ بابائے اردو نے آج سے ۵۸ سال پہلے میر کے تذکرے 'نکات الشعرا' کو حبیب الرحمٰن خان شروانی کے فاضلانہ مقدمے کے ساتھ ۱۹۲۲ء میں انجمن ترقی اردو سے شائع کیا اور بعد میں اس کا ایک اور بہتر ایڈیشن خود مرتب کرکے ۱۹۳۵ء میں شائع کیا۔ محمد تقی میر کا 'نکات الشعرا' اردو زبان کا پہلا تذکرہ ہے جو شمالی ہند میں ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء میں مکمل ہوا۔ نکات الشعرا کے بعد

بابائے اردو نے "ذکرِ میر" کو تلاش کرکے ۱۹۲۸ء میں اپنے مقدمے کے ساتھ انجمن ترقی اردو سے شائع کیا۔ "ذکرِ میر" میں محمد تقی میر نے اپنے اور اپنے دور کے حالات قلم بند کیے ہیں۔ میر کی ان دو تصانیف کی اشاعت نے میر کی شاعری کے مطالعے کا نہ صرف رُخ بدل دیا بلکہ ادب کے مؤرخوں کو اردو ادب کی تاریخ نئے سرے سے مرتب کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ بابائے اردو کو میر سے گہرا ذہنی تعلق تھا۔ میر ہمارے وہ شاعر ہیں جن کا اثر و فیض آج تک جاری ہے۔ میر نہ صرف اردو کے بلکہ دنیا کے عظیم غنائی شاعروں میں سے ایک ہیں:

نہیں ملتا سخن اپنا کسو سے — ہماری گفتگو کا ڈھب الگ ہے

(دیوان دوم)

میں نے یہ لیکچر، جس کی تیاری میں مجھے سوا سال کا عرصہ لگا، دو مختلف نشستوں میں آپ کے سامنے پیش کرنے کے لئے تیار کئے ہیں۔

پہلا لیکچر میر کے حالاتِ زندگی، سیرت و شخصیت اور تصانیف کے بارے میں ہے تاکہ سننے والے میر کے تخلیقی سرچشموں سے پورے طور پر روشناس ہو سکیں اور یہ بات واضح ہو سکے کہ آخر میر ایسی شاعری کیسے کر سکے؟ ان کے ذہن کی ساخت کی نوعیت کیا تھی؟ انہوں نے اپنے مخصوص رنگِ سخن سے کیسے اپنے دور کی ترجمانی کرکے اس کا تزکیہ (کیتھارس) کیا۔ اسی لیکچر میں ان کی تصانیف کا تعارف و مطالعہ شامل ہے۔ اسی سلسلے میں میں نے میر کے چھ دواوین کے زمانۂ تدوین کا بھی تعین کیا ہے۔ دوسرے لیکچر میں میر کی شاعری کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ ان لیکچروں میں میں نے 'نئے میر' کو اپنی نسل اور اپنے دور کے لئے دریافت کیا ہے۔ اگر ان لیکچروں کو سن کر آپ محسوس کریں کہ آپ جتنا میر کو پہلے جانتے تھے آج اس سے زیادہ جان گئے ہیں تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت اکارت نہیں گئی۔ لیکچر کے بعد اگر آپ کوئی سوال پوچھنا چاہیں یا کسی نکتے کی وضاحت مطلوب ہو تو خاکسار حاضر ہے۔

آخر میں ایک بات اور عرض کر دوں کہ ہمارے ہاں تخلیقی، تنقیدی و تحقیقی

صلاحیتوں کو الگ الگ خانوں میں اس طور پر تقسیم کیا جاتا ہے کہ جیسے ایک صلاحیت دوسرے سے بے تعلق ہے اور اسی علیحدگی کی وجہ سے عام طور پر اُردو ادیبوں کی تحریریں پورے طور پر ایک وحدت، ایک اکائی، نہیں بن پاتیں۔ میرے لئے یہ تینوں صلاحیتیں بیک وقت ایک فطری ادیب میں موجود ہوتی ہیں اور ان سب کے بیک وقت استعمال کے بغیر ادیب کی صلاحیتیں صحیح معنی میں پورے طور پر بروئے کار نہیں آسکتیں۔ میں نے اس لیکچر میں بھی تحقیق و تنقید کو تخلیقی سطح پر ایک اکائی بنانے کی کوشش کی ہے جسے اہلِ نظر یقیناً محسوس کر سکتے ہیں۔

ان الفاظ کے ساتھ میں آج کے موضوع "محمد تقی میر" کی طرف آتا ہوں۔

پہلا لیکچر

محمد تقی میر

حیات، سیرت اور تصانیف

نامساعد حالات سے تنگ آکر ملکِ حجاز کا ایک خاندان ہجرت کر کے دکن پہنچا اور کچھ عرصہ وہاں قیام کر کے احمد آباد آگیا۔ اس خاندان کے کچھ افراد تو وہیں آباد ہو گئے اور کچھ تلاشِ روزگار میں مغلوں کے دارالحکومت اکبرآباد آگئے۔ انھیں میں میر کے جدِ اعلیٰ بھی تھے ــــــ اکبرآباد کی آب و ہوا انہیں راس نہ آئی اور انتقال کر گئے۔ انہوں نے ایک لڑکا چھوڑا جو میر کے دادا تھے۔ تلاش و جستجو کے بعد میر کے دادا کو (ذکرِ میر، میں سوائے اپنے والد کے کسی کا نام نہیں لکھا) نواحِ اکبرآباد میں فوج داری کی ملازمت مل گئی، لیکن وہ بھی پچاس سال کی عمر میں وفات پا گئے۔ ان کے دو لڑکے تھے۔ ایک جوانی میں خللِ دماغ سے مر گئے اور دوسرے محمد علی[ف] تھے، جنہوں نے شاہ کلیم اللہ اکبرآبادی (م ۱۱۰۹ھ/۹۸-۱۶۹۷ء) سے علومِ متداولہ کی تحصیل کر کے درویشی اختیار کر لی اور اپنے زہد و تقویٰ کی وجہ سے علی متقی کے خطاب سے موسوم ہوئے۔[۲] محمد علی متقی کی پہلی شادی سراج الدین علی خان آرزو کی بڑی بہن سے ہوئی جن کے بطن سے حافظ محمد حسن پیدا ہوئے۔ دوسری بیوی کے بطن سے دو بیٹے محمد تقی اور محمد رضی اور ایک بہن (زوجہ محمد حسین کلیم) پیدا

ف "ذکرِ میر" میں میر نے اپنے والد کو ہر جگہ علی متقی لکھا ہے لیکن ایک جگہ، جب خواجہ محمد باسط میر کو اپنے چچا صمصام الدولہ کے پاس لے گئے تو انہوں نے دریافت کیا "ایں پسر از کیست۔ گفت از میر محمد علی است" اس سے معلوم ہوا کہ میر کے والد کا نام محمد علی تھا ــــــ "ذکرِ میر" محمد تقی میر، مرتبہ عبدالحق، ص ۶۲، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد ۱۹۲۸ء

ہوئے یہی محمد تقی بڑے ہو کر خدائے سخن میر تقی میر کہلائے اور اردو زبان و ادب پر ایسے گہرے نقوش ثبت کئے کہ رہتی دنیا تک ان کا نام باقی رہے گا۔

محمد تقی میر (۱۱۳۵ھ ـــــ ۲۰ شعبان ۱۲۲۵ھ / ۲۳۔۱۷۲۲ ـــــ ۲۰ ستمبر ۱۸۱۰ء) کی ولادت کے بارے میں مختلف رائیں ہیں لیکن یہ سب قیاسات دیوانِ چہارم نسخۂ محمود آباد کی اس عبارت کے بعد، جو خود میر کے بھتیجے محمد محسن کے اپنے قلم سے لکھی ہوئی ہے، ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ دیوانِ چہارم میر کے داماد، بھانجے، شاگرد اور محمد حسین کلیم کے بیٹے محمد حسن علی تجلی کے قلم کا لکھا ہوا ہے اور دیوان پر وہ عبارت، جو میر حسن محسن کے اپنے قلم سے لکھی ہوئی ہے، یہ ہے:

"۲۰ شعبان ۱۲۲۵ھ کو بروز جمعہ بوقت شام میر محمد تقی صاحب میر تخلص نے جن کا یہ دیوانِ چہارم ہے، شہر لکھنؤ کے محلہ سٹھٹی میں نوّے سال کی عمر پوری کرکے انتقال کیا۔ اور اسی مہینے کی ۲۱ تاریخ کو ہفتے کے دن دوپہر کے وقت اکھاڑہ بھیم میں جو مشہور قبرستان ہے، اپنے عزیزوں کی قبروں کے قریب دفن ہوئے اور اپنے چار دیوان، جن میں سے یہ چوتھا ہے، محرّرِ سطور محمد محسن المخاطب زین الدین احمد کو (خدا اس کے گناہ معاف کرے) اپنی زندگی میں کمال رغبت کے ساتھ عنایت کئے۔ خدا ان کی مغفرت فرمائے۔

محمد محسن عفی عنہٗ نے ۲۲ شعبان سنہ مذکور کو، جب چار گھڑی دن باقی تھا، تحریر کیا۔ اس دیوان پر میر مغفور کے داماد میر حسن علی تجلی کے دستخط ہیں۔[۳]

اس تحریر سے یہ چند باتیں سامنے آئیں:

۱۔ میر کا انتقال ۲۰ شعبان کو جمعہ کے دن شام کے وقت ۱۲۲۵ھ میں ہوا۔
۲۔ انتقال کے وقت میر محلہ سٹھٹی میں رہتے تھے اور اس وقت ان کی عمر ۹۰ سال ہو چکی تھی۔
۳۔ شنبہ (سنیچر) کے دن ۲۱ شعبان کو دوپہر کے وقت لکھنؤ کے مشہور قبرستان اکھاڑہ بھیم میں اپنے اقربا کے قریب مدفون ہوئے۔

اس طرح اگر ۱۲۲۵ھ میں سے ۹۰ نکال دیئے جائیں تو سالِ ولادت ۱۱۳۵ھ / ۲۳۔

۱۷۲۲ء نکلتا ہے۔ اس سنِ پیدائش کی مزید تصدیق اسی دیوانِ چہارم پر لکھی ہوئی اس عبارت سے بھی ہوتی ہے جو "سوانح میر تقی میر" کے زیرِ عنوان کسی معدوم تذکرے "نوادر الکملا" سے نقل کی گئی ہے۔ اس عبارت کا ابتدائی جملہ یہ ہے:

"اصلاً اکبر آباد کے تھے۔ ۱۱۳۵ھ کے آخر میں پیدا ہوتے۔"[۴]

ان شواہد کی روشنی میں مولوی عبدالحق کا متعین کردہ سال ولادت ۱۱۳۵ھ، جس کی تصدیق فائق رامپوری نے بھی کی ہے یا سر شاہ سلیمان کے دلائل، جن سے سال پیدائش ۱۱۳۶ھ مقرر ہوتا ہے، قابلِ قبول نہیں رہتے۔ اور میر کا سال ولادت ۱۱۳۵ھ متعین ہو جاتا ہے۔ میر کی وفات پر مصحفی نے اس شعر سے:

از سر درد مصحفی نے کہا ـــــ حق میں اس کے "ہوا نظیری آج" ۱۲۲۱+۴ = ۱۲۲۵ھ

اور ناسخ نے "واویلا مُردہ شاعران" سے سال وفات ۱۲۲۵ھ نکالا۔

۱۱۳۵ھ اور ۱۲۲۵ھ (۱۷۲۲ء اور ۱۸۱۰ء) کا زمانہ برِ عظیم کی تاریخ میں انتشار و خلفشار کا دور رہا ہے۔ مغلیہ سلطنت کا زوال اور انگریزوں کا اقتدار اسی دور میں مکمل ہوا۔ معاشرے میں تہذیبی و فکری سطح پر تبدیلی کا عمل بھی اسی زمانے میں شروع ہوا۔ نازک مزاج و حساس میر بھی اسی معاشرے کے فرد تھے اسی لئے خارجی و داخلی طور پر وہ معاشرے کے عام فرد سے کہیں زیادہ متاثر ہوئے۔ ان کے ذاتی حالات اور اس دور کے المیوں نے ان کی شخصیت و سیرت کو وہ بنا دیا جو وہ ہمیں نظر آتی ہے اور ان کی شاعری اس کشمکش کی ترجمان بن گئی جو ان کی ذات، معاشرہ اور زندگی کی باہم آویزش سے پیدا ہوئی تھی۔ میر کے ذہن اور ان کی سیرت و شخصیت کو سمجھنے کے لئے ان حالات کا جاننا ضروری ہے۔

میر ایک نہایت غریب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد محمد علی متقی درویش صفت انسان تھے اور برِ عظیم میں نہ سہی کم از کم اکبر آباد میں اپنے زہد و تقویٰ کی وجہ سے شہرت رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب اپنے والد کی وفات ۲۱ رجب ۱۱۴۶ھ / ۱۸ دسمبر

۱۷۳۴ء[ث]) کے بعد گیارہ سالہ محمد تقی بے سہارا ہو گئے تو اپنے چھوٹے بھائی محمد رضی کو گھر بٹھا کر اطراف شہر میں تلاش روزگار کے لئے نکل کھڑے ہوتے لیکن روزگار کہاں تھا جو ملتا۔ آخر کار ناچار ہو کر ۱۱۴۷ھ / ۳۵-۱۷۳۴ء میں شاہجہان آباد کے لئے روانہ ہوئے۔ یہاں بھی وہ پریشان و سرگرداں رہے۔ "بسیار گردیدم شفیقے ندیدم" کے الفاظ سے ان کی پریشان حالی کا اندازہ ہوتا ہے۔ کچھ عرصے بعد دہلی میں خواجہ محمد باسط (م ۱۱۷۸ھ / ۶۵-۱۷۶۴ء)[۱۰] سے ان کی ملاقات ہوئی اور محمد باسط نے انہیں اپنے چچا صمصام الدولہ کی خدمت میں پیش کیا۔ صمصام الدولہ نے محمد علی متقی کی وفات پر نہ صرف اظہار افسوس کیا بلکہ یہ کہہ کر کہ "مجھ پر اس شخص کے حقوق ہیں"[۱۱] ایک روپیہ روز وظیفہ مقرر کر دیا۔ یہ وظیفہ میر کو ۱۱۵۱ھ / ۱۷۳۹ء تک ملتا رہا لیکن جب صمصام الدولہ نادر شاہ سے جنگ میں زخمی ہوئے اور ۱۹ ذی قعدہ ۱۱۵۱ھ[۱۲] / ۱۸ فروری ۱۷۳۹ء کو فوت ہو گئے تو یہ وظیفہ بند ہو گیا اور میر

ث۔ میر کے منہ بولے چچا امان اللہ عید کے دن بیمار ہوئے اور دوسرے دن انتقال کیا۔ اس وقت جیسا کہ "ذکرِ میر" میں اپنے والد کے حوالے سے میر نے لکھا ہے کہ ان کی عمر دس سال تھی گویا ۲ شوال ۱۱۴۵ھ / ۷ مارچ ۱۷۳۳ء کو میر کے چچا امان اللہ نے وفات پائی۔ ان کی وفات کے بعد محمد علی متقی کی حالت غیر ہو گئی اور خود کو "عزیز مردہ" کے نام سے موسوم کرنے لگے۔ ایک دن جب وہ امان اللہ کے فاتحۂ چہلم کا حلوہ تقسیم کر رہے تھے کہ ایک نوجوان احمد بیگ آیا جو علی متقی کی توجہ کے باعث وہیں ٹھہر گیا اور سات مہینے سخت ریاضت کر کے مرتبۂ کمال کو پہنچ گیا۔ میر نے اپنے والد کی تاریخِ وفات ۲۱ رجب (ذکرِ میر ص ۵۸) لکھی ہے' چونکہ امان اللہ کی وفات کے ایک سال بعد' جیسا کہ ذکرِ میر میں لکھا ہے' علی متقی کا انتقال ہوا اس لئے میر کے والد نے ۲۱ رجب ۱۱۴۶ھ کو وفات پائی۔ قاضی عبدالودود نے دلّی کالج میگزین' میر نمبر' ص ۴۰ پر لکھا ہے کہ "۲۱ رجب تھی ۱۱۴۶ ہونا چاہیئے"۔ اور صفدر آہ نے "میر و میریات" (ص ۹۳ علوی بک ڈپو بمبئی ۱۹۷۷ء) میں بھی یہی سن دیا ہے اور لکھا ہے کہ "یہ تاریخ بلا استثنا متفقہ ہے"۔ ـــــ ج۔ ج

اکبر آباد میں[ث] پھر بے سہارا ہو گئے۔ اس وقت دہلی کی حالت نہایت تباہ تھی۔ نادر شاہ کی لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت گری نے شہر و اہل شہر کو برباد و قلاش کر دیا تھا۔ اس لئے ۶ محرم ۱۱۵۲ھ[۱۳] / ۱۵ اپریل ۱۷۳۹ء کو جب نادر شاہ نے دلّی سے کوچ کیا اور کچھ عرصے بعد حالات ذرا معمول پر آئے تو میر ناچار ہو کر دوسری بار دلّی پہنچے[۱۴] اور اپنے سوتیلے ماموں سراج الدین علی خان آرزو کے ہاں ٹھہرے۔ اس وقت میر کی عمر سترہ سال تھی۔ آرزو کے ہاں میر تقریباً سات سال رہے جس سے وہ بعد میں منکر ہو گئے اور "ذکرِ میر" میں صرف اتنا لکھا ہے کہ "کچھ دن ان کے پاس رہا۔" سراج الدین خان آرزو کے ہاں سات سال رہنے کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ میر آرزو سے ناراض ہو کر جب رعایت خان کے متوسل ہوئے تو پہلی بار ۱۱۶۱ھ / ۴۸-۱۷۴۷ء میں' جب احمد شاہ ابدالی سے مقابلہ کرنے کے لئے شاہی افواج کوچ کر رہی تھیں اور رعایت خان بھی افواج کے ساتھ تھا' وہ رعایت خان کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ میر نے لکھا ہے کہ "میں اس سفر میں خان منظور کے ساتھ تھا اور خدمات بجا لاتا تھا"[۱۵]۔ اگر رعایت خان سے ان کی ملازمت کو ۱۱۶۱ھ سے ایک سال پہلے بھی مان لیا جائے (حالانکہ ۱۱۶۱ھ سے پہلے رعایت خان سے کسی تعلق کا کوئی ذکر نہیں ملتا) تو گویا ۱۱۶۰ھ تک وہ خان آرزو کے ہاں مقیم تھے پھر شام کے کھانے پر' جیسا کہ ذکرِ میر میں لکھا ہے' خان آرزو سے میر کی تلخی ہوئی اور وہ کھانا چھوڑ کر چلے گئے اور حوض قاضی پہنچے۔ وہاں علیم اللہ نامی شخص انہیں قمر الدین خان کے پاس لے گیا۔ گویا رعایت خان تک پہنچنے میں' خان آرزو سے الگ ہو کر' انہیں بہت کم وقت لگا جس

ف۔ بعض اہل علم کا خیال ہے کہ میر وظیفہ پا کر اکبر آباد نہیں گئے۔ لیکن یہ خیال درست نہیں ہے۔ وظیفہ پا کر اکبر آباد واپس چلے جانے کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ ذکرِ میر میں ۱۱۴۶ھ تا ۱۱۵۲ھ کا کوئی واقعہ نہیں ملتا حتیٰ کہ نادر شاہ کے حملے کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے۔ پھر گیارہ سالہ میر اپنے چھوٹے بھائی محمد رضی اور اپنی بہن کو اکبر آباد میں چھوڑ کر دہلی آئے تھے اور ان کا اکبر آباد واپس جانا ضروری تھا۔ اس لئے جب صمصام الدولہ کی وفات کے بعد ان کا مقررہ وظیفہ بند ہو گیا تو "ناچار بار دیگر بہ دہلی رسیدم" (ذکرِ میر ص ۶۳) کے الفاظ لکھے ہیں۔ اگر وہ اس عرصے میں اکبر آباد میں نہیں رہے تو "ناچار بار دیگر" کے کیا معنی ہوتے ہیں؟ ـــــ ج۔ ج

کے ساتھ اپنے موجود ہونے کا ذکر وہ ۱۱۶۱ھ/۴۸-۱۷۴۷ء میں پہلی بار کرتے ہیں۔

محمد تقی میر نے اپنی تعلیم و تربیت اور خان آرزو سے کسبِ فیض کا ذکر بھی "ذکر میر" میں نہیں کیا بلکہ لکھا کہ "شہر کے دوستوں سے چند کتابیں پڑھیں"۱۷۔ اور یہ بھی لکھا کہ میرے سوتیلے بھائی حافظ محمد حسن کے لکھنے پر کہ "میر محمد تقی فتنۂ روزگار ہے۔ ہرگز اس کی تربیت نہیں کرنی چاہیے اور دوستی کے پردے میں اس کا کام (تمام) کر دینا چاہیے"! خان آرزو نے آنکھیں پھیر لیں اور ایسی دشمنی اختیار کی کہ "اس کی دشمنی اگر تفصیل سے بیان کی جائے تو ایک الگ دفتر چاہیے"[18] آخر جب یہ صورتِ حال تھی تو میر نے اپنے تذکرے "نکات الشعرا" میں آرزو کے بارے میں یہ عبارت کیوں لکھی کہ "اس فنِ بے اعتبار کو، کہ ہم نے اختیار کیا ہے (آرزو) نے ہی اعتبار دیا ہے"۱۹۔ اور انہیں "استاد و پیر و مرشدِ بندہ"۲۰ کے الفاظ سے کیوں مخاطب کیا۔ نکات الشعرا اور ذکرِ میر دونوں کے بیان متضاد ہیں۔ ان میں سے ایک ہی بات صحیح ہو سکتی ہے۔ آرزو کا انتقال ۱۱۶۹ھ/۱۷۵۶ء میں ہوا۔ نکات الشعرا ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء میں مکمل ہوا اور ذکرِ میر کا آغاز ۱۱۸۵ھ/۷۲-۱۷۷۱ء میں ہوا۔ اس وقت آرزو میر کے کسی بیان کی تردید کرنے کے لئے موجود نہ تھے۔ یہ بات قرینِ قیاس نہیں ہے کہ آرزو جیسے یگانۂ روزگار کے پاس نوعمری کے زمانے میں میر تقریباً سات سال رہیں اور آرزو ان کی تعلیم و تربیت نہ کریں۔ آرزو کے گھر میں رہتے ہوئے میر کو وہ سہولت میسر تھی جو کسی دوسرے کو نہیں تھی۔ اس امر کا ثبوت کہ میر نے آرزو سے کسبِ فیض کیا اس دور کے تذکروں سے بھی ملتا ہے۔ قائم نے، جو دہلی میں میر کے قریب ہی رہتے تھے۲۱ لکھا ہے کہ "مدت تک ان (آرزو) کی خدمت میں استفادۂ آگاہی (علم) کر کے اسم و رسم بہم پہنچایا"۲۲۔ میر حسن نے "ان (خان آرزو) کے شاگردوں میں سے ہے"۲۳ کے الفاظ لکھے ہیں۔ قدرت اللہ قاسم نے لکھا ہے کہ "جناب فیض مآب خان مشارٌ الیہ (آرزو) سے نسبت تلمذ بھی رکھتا ہے لیکن غرور کی وجہ سے کہ جس نے اس کے دماغ میں جگہ کر لی ہے، اس حقیقت سے، جو دراصل اس کے لئے سرمایۂ افتخار ہے، پورے طور پر انکار کرتا ہے۔ اس کے غرور و نخوت کے بارے میں کیا لکھوں۔ اس کی کوئی حد نہیں ہے"۲۴۔ تذکرۂ عشقی میں "تربیت کردۂ سراج الدین علی خان آرزو"۲۵ کے الفاظ ملتے ہیں۔ لوادر الکلام میں لکھا ہے کہ "پدرِ بزرگوار کے سانحہ کے بعد، ۱۱ سال کی عمر میں دہلی گئے اور سراج الدین علی خان آرزو کے

مکان پر قیام کر کے علوم عقلی و نقلی کی تکمیل کی۔ بعد میں جب ان کے درمیان جدائی واقع ہوئی تو رؤسائے عظام کی سرکار میں بسر کی"۲۶۔ ان تمام تذکرہ نگاروں اور نکات الشعرا میں خود میر کے اپنے اعتراف کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انہوں نے خان آرزو ہی سے کسبِ فیض کیا ہے۔ خود ذکر میر میں جو فارسی محاورات استعمال ہوئے ہیں سوائے آرزو کی لغت "چراغِ ہدایت" کے اور کہیں نہیں ملتے مثلاً آتش مال، استخوان شکنی، بر خویش چیدہ، بزآویزی، بزگیری، بے نہ، بے پیچ، تر سبیل، خایہ گزک، درونہ، دریائے لنگردار، دل زدہ، زنجیرہ، زنخ زن، زیادہ سری، سجادۂ محرابی، سر نشین، شیرہ خانہ، شیشہ جان، صورت باز، طفلانِ تہ بازار، غنچہ پیشانی، کل مکل، یال و کوپال"۲۷ وغیرہ۔

اردو شاعری کے آغاز کے بارے میں سعادت علی سعادت امروہوی کے حوالے سے ذکر میر میں لکھا ہے کہ "اس عزیز نے مجھے ریختہ کی طرف متوجہ کیا"۲۸ جب کہ نکات الشعرا میں صرف یہ لکھا ہے کہ "بندے کے ساتھ بہت ربط ضبط رکھتا تھا"۲۹ میر کی اردو شاعری کا آغاز بھی خان آرزو کی تحریک پر ہوا۔ اس کی تفصیل سعادت خان ناصر نے یہ لکھی ہے کہ

"یہ نقل فرماتے تھے کہ عنفوانِ جوانی میں جوشِ وحشت اور استیلائے سودا طبیعت پر غالب ہوا اور زبان و کام ہرزہ گوئی پر غالب، ترکِ ننگ و نام بلکہ رسوائی خاص و عام پسند آئی۔ ہر کسی کو دشنام دینا شعار اور سنگ زنی کار و بار تھا۔ خان آرزو نے کہا کہ اے عزیز دشنام موزوں دعائے ناموزوں سے بہتر اور رخت کے پارہ کرنے سے تقطیعِ شعر خوش تر ہے۔ چونکہ موزونیِ طبیعت جوہرِ ذاتی تھی جو دشنام زبان تک آئی مصرع یا بیت ہو گئی بعد اصلاح دماغ و دل کے مزا شعر گوئی کا طبیعت پر رہا۔ کبھی کبھی دو چار شعر جو خان آرزو کی خدمت میں پڑھے پسند فرمائے اور تاکید شعر و سخن کی زیادہ سے زیادہ کی۔ ایک دن خان آرزو نے ان سے کہا کہ آج مرزا رفیع آئے اور یہ مطلع نہایت مباحات کے ساتھ پڑھ گئے:

چمن میں صبح جو اس جنگجو کا نام لیا
صبا نے تیغ کا آبِ رواں سے کام لیا

میر صاحب نے اس کو سن کر بدیہتہً یہ مطلع پڑھا:

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو اپنے تھام تھام لیا

خان آرزو فرطِ خوشی سے اچھل پڑے اور کہا خدا چشم بد سے محفوظ رکھے۔[۴۰]

سعادت خان ناصر کے اس بیان سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ میر نے اس زمانے میں جب وہ عالمِ جنون میں تھے، خان آرزو کے مشورہ پر ریختہ گوئی شروع کی۔ یہ ۱۱۵۳/۱۱۵۴ھ (۴۱-۱۷۴۰ء) کا زمانہ ہے۔ میر ۱۱۵۲ھ/۱۷۳۹ء میں دلی آئے اور کچھ عرصے بعد جنون کے مرض میں مبتلا ہو کر "زندانی و زنجیری" ہو گئے۔ جنون میر کا خاندانی مرض تھا۔ ان کے چچا اسی بیماری میں فوت ہوئے تھے۔ ایک سال سے زیادہ عرصہ پورے طور پر صحت یاب ہونے میں لگا۔ اس جنون کا ذکر میر نے تفصیل کے ساتھ "ذکرِ میر" میں کیا ہے اور اس موضوع پر ایک مثنوی "خواب و خیال" بھی لکھی ہے۔ بیماری کے دوران شاعری کا آغاز ہوا اور بیماری کے بعد تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ میر میں شعر گوئی کی صلاحیت پیدائشی تھی جلد ہی مشق بہم پہنچا کر شعرائے دہلی میں ممتاز ہو گئے۔ میر نے لکھا ہے کہ "میرے اشعار تمام شہر میں پھیل گئے اور چھوٹے بڑوں کے کان تک پہنچ گئے۔"[۴۱] میر ۱۱۵۲ سے ۱۱۵۹ یا ۱۱۶۰ھ (۱۷۳۹-۱۷۴۶ء) تک آرزو کے پاس رہے اور پھر رعایت خان کے متوسل ہو گئے۔ احمد شاہ ابدالی سے جنگ میں قمر الدین خان بری طرح زخمی ہوئے اور وفات پا گئے۔ اسی اثنا میں محمد شاہ کے انتقال کی خبر پہنچی۔ رعایت خان صفدر جنگ کے ہمراہ دہلی پہنچے۔ میر بھی ان کے ساتھ دہلی آئے۔ محمد شاہ کے بعد احمد شاہ ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء میں تخت پر بیٹھا تو صفدر جنگ کو اپنا وزیر مقرر کیا اور راجہ بخت سنگھ کو اجمیر کا صوبہ دار بنا کر اس کے اپنے بھائی کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا۔ رعایت خان بخت سنگھ کے ساتھ تھا اور میر رعایت خان کے ساتھ تھے۔ یہ شوال ۱۱۶۱ھ/ستمبر ۱۷۴۸ء کا زمانہ ہے۔[۴۲] اسی سفر میں میر نے خواجہ اجمیری کے مزار کی زیارت

کی۔ کچھ دن بعد جب بخت سنگھ اور رعایت خان میں جھگڑا ہو گیا اور میر ان دونوں کے درمیان صلح صفائی کرانے میں ناکام رہے تو رعایت خان کے ساتھ وہ بھی دہلی آ گئے، لیکن یہ توسّل بھی زیادہ عرصہ نہ رہا۔ ایک دن چاندنی رات میں ایک مراثی کا لڑکا رعایت خان کے سامنے گا رہا تھا۔ رعایت خان نے میر صاحب سے فرمائش کی کہ اس لڑکے کو اپنے چند شعر یاد کرا دیجئے تاکہ یہ انھیں ساز پر گائے۔ میر کو یہ بات ناگوار گزری لیکن پھر بھی اپنے پانچ شعر اُسے یاد کرا دیئے اور دو تین دن بعد گھر بیٹھ گئے۔ رعایت خان نے میر کا پھر بھی خیال کیا اور ان کے چھوٹے بھائی محمد رضی کو اپنے ہاں ملازم رکھ لیا۔[۴۳] یہ واقعہ ۱۱۶۲ھ/۱۷۴۹ء کا ہو سکتا ہے۔ کچھ عرصے بعد میر نے خواجہ سرا نواب بہادر جاوید خان کی ملازمت اختیار کر لی اور بخشی فوج اسد یار خان انسان کی سفارش پر گھوڑا اور تکلیف نوکری سے معافی مل گئی۔[۴۴] میر کا یہ زمانہ قدرے آرام و فراغت سے گذرا۔ اسی عرصے میں انہوں نے اپنا تذکرہ "نکات الشعرا" مکمل کیا لیکن جب ۲۸ شوال ۱۱۶۵ھ[۴۵] / ۲۸ اگست ۱۷۵۲ء کو صفدر جنگ نے ضیافت کے بہانے جاوید خان کو اپنے ہاں بلا کر قتل کرا دیا تو میر پھر بے روزگار ہو گئے۔ اس بے روزگاری کے زمانے میں صفدر جنگ کے دیوان مہانراین نے میر کم الدین علی سلامؔ[ف] کے ہاتھ انہیں کچھ بھیجا اور شوق سے بلوایا تو میر کے چند مہینے اور فراغت سے گذر گئے۔ اسی زمانے میں (۱۱۶۶ھ/۵۳-۱۷۵۲ء) میر نے خان آرزو کا پڑوس چھوڑ دیا اور امیر خان انجام کی حویلی میں اُٹھ آئے۔ دہلی کی حالت دگرگوں تھی، امرا کی باہمی آویزشیں روز نئے نئے گل کھلاتی تھیں۔ ۱۱۶۷ھ/۵۴-۱۷۵۳ء میں صفدر جنگ کی حماقت سے مرہٹوں نے پھر دلّی کو تاراج کیا اور عماد الملک نے احمد شاہ کو قید کر کے ۱۰ شعبان ۱۱۶۷ھ/ ۲ جون ۱۷۵۴ء کو آنکھوں میں سلائیاں پھیر کر اندھا کر دیا۔ میر کا یہ مشہور شعر اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے:

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاکِ پا جن کی
انہیں کی آنکھوں میں پھرتے سلائیاں دیکھیں

ف۔ نکات الشعرا میں میر نے لکھا ہے کہ "فقیر را با او از تہِ دل اخلاص است چنانچہ اکثر اوقات اتفاق باہم فکر شعر کردن و گپ زدن و مزاج نمودن می افتد"۔ (ص ۱۴۱، نظامی پریس بدایون ۱۹۲۲ء) سلام میر شرف الدین علی پیام اکبر آبادی کے بیٹے تھے۔ (ج۔ ج)

میر نے لکھا ہے کہ "میں اس سفر وحشت اثر میں احمد شاہ کے ہمراہ تھا"[۳۶] واپس آکر میر گوشہ نشین ہو گئے۔ ۱۰، ذالحجہ ۱۱۶۷ھ / ۷، اکتوبر ۱۷۵۴ء کو صفدر جنگ نے وفات پائی اور ان کے بیٹے شجاع الدولہ اودھ کے صوبیدار مقرر ہوئے۔ اسی زمانے میں خان آرزو سالار جنگ کے ہمراہ لکھنو چلے گئے اور وہیں ۲۳، ربیع الثانی ۱۱۶۹ھ / ۲۷، جنوری ۱۷۵۶ء کو وفات پا گئے۔ دو تین ماہ بعد ۱۱۶۹ھ / ۱۷۵۶ء میں راجہ جگل کشور، جو محمد شاہ کے زمانے میں وکیل بنگالہ تھے، میر کو گھر سے بلا کر لے گئے اور اصلاحِ شعر کی خدمت ان کے سپرد کی۔ میر نے لکھا ہے کہ "راجہ کا کلام ناقابلِ اصلاح تھا اور میں نے انکی اکثر تصنیفات پر خط کھینچ دیا"[۳۷] اسی زمانے میں راجہ ناگر مل نیابت وزارت پر فائز ہوئے۔ ۱۱۷۱ھ / ۱۷۵۷ء میں احمد شاہ ابدالی نے پھر حملہ کیا اور لاہور کو روندتا ہوا دلی پہنچا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ میر کی معاشی حالت خراب سے خراب تر ہو گئی۔ ذکر میر میں لکھا ہے کہ "میں کہ (پہلے ہی) فقیر تھا اور فقیر ہو گیا۔ میرا حال بے اسبابی اور تہی دستی کی وجہ سے ابتر ہو گیا۔ شاہراہ پر جو میرا جھونپڑا تھا، مسمار ہو گیا"[۳۸] اسی عالم میں راجہ جگل کشور کے پاس گئے اور روزگار کی شکایت کی۔ راجہ کی مالی حالت خود خراب تھی۔ لیکن وضع دار اور شریف النفس انسان تھا۔ انہیں راجہ ناگر مل کے پاس لے گیا۔ وہ بہت لطف و عنایت سے پیش آیا۔ اور دوسرے دن جب شعر و شاعری کی محفل جمی تو کہا "میر کی ہر بیت موتی کی مانند ہے۔ اس جوان کا طرز مجھے بہت پسند ہے"[۳۹]۔ اس کے بعد ایک سال "آرام" سے گذر گیا۔ احمد شاہ ابدالی کے اس حملے کے بعد میر اپنے اہل و عیال کے ساتھ دلّی سے نکل کھڑے ہوئے اور ابھی آٹھ نو کوس کی مسافت طے کر کے بے سر و سامانی کے عالم میں، ایک پیڑ کے نیچے بیٹھے تھے کہ راجہ جگل کشور کی بیوی وہاں سے گذریں اور میر کو بے آسرا دیکھ کر اپنے ساتھ برسانہ لے گئیں۔ میر وہاں سے کامان ہوتے ہوئے کھمیر پہنچے۔ اسی اثنا میں راجہ ناگر مل بھی وہاں آگئے۔ میر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور وہاں سے نکل جانے کی اجازت چاہی۔ راجہ نے کہا کیا "بیابان مرگ" میں جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟ اسی دن خرچ کے واسطے کچھ بھیجا اور وظیفہ بدستور سابق دستخط کر کے عنایت کیا۔ حالات کی خرابی کی وجہ سے راجہ نے یہاں سکونت اختیار کر لی تھی۔ راجہ ناگر مل سے میر کا توسل ۱۱۷۱ سے ۱۱۸۴ھ (۱۷۵۷ء - ۱۷۷۰ء) تک تقریباً ۱۳ سال قائم رہا۔ ابھی یہ بلائیں تمام نہیں ہوئی تھیں

کہ عماد الملک نے عالمگیر ثانی کو بھی قتل کرا دیا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ مرہٹے شمالی ہند میں دندناتے پھر رہے تھے۔ بھاؤ نے دہلی پر قبضہ کر کے ۱۹، صفر ۱۱۷۴ھ / یکم اکتوبر ۱۷۶۰ء کو شاہجہان ثانی کو معزول کر دیا اور شہزادہ جواں بخت (شاہ عالم ثانی) کو تخت پر بٹھا دیا اور اٹک تک کا علاقہ بھی اپنے قبضہ میں لے لیا۔ مرہٹوں کی اس حرکت پر احمد شاہ ابدالی مشتعل ہو کر پھر حملہ آور ہوا اور ۶، جمادی الآخر ۱۱۷۴ھ / ۱۴، جنوری ۱۷۶۱ء کو ابدالی اور مرہٹوں کی درمیان وہ جنگ ہوئی جسے پانی پت کی تیسری جنگ کا نام دیا جاتا ہے۔ اس نے مرہٹوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ فاتح احمد شاہ ابدالی دہلی میں داخل ہوا اور اطراف کے سرداروں کے نام پیغام بھیجے۔ ایک تحریر راجہ ناگر مل کو بھی بھیجی۔ میر بھی راجہ ناگر مل کے ساتھ کھمیر سے دہلی پہنچے۔ دہلی کی حالت نہایت خراب تھی۔ ایک دن میر شہر کی طرف گئے تو ویرانے کو دیکھ کر ان کی حالت غیر ہو گئی۔ ذکر میر میں لکھا ہے کہ "ہر قدم پر میں رویا اور عبرت حاصل کی۔ جب آگے بڑھا تو اور حیران ہوا۔ مکان پہچان میں نہ آئے۔ در و دیوار نظر نہ آئے۔ عمارت کی بنیادیں نظر نہ آئیں۔ رہنے والوں کی کوئی خبر نہ ملی"[۴۰]۔ جنگِ پانی پت سے فارغ ہو کر جب احمد شاہ ابدالی واپس ہوا تو سورج مل نے آگرہ پر قبضہ کر لیا اور جب اسے خبر ملی کہ بادشاہ ایک بڑے لشکر کے ساتھ مقابلے کے لئے آرہا ہے تو اس نے راجہ ناگر مل کو آنے کی دعوت دی۔ میر بھی راجہ ناگر مل کے ہمراہ آگرہ پہنچے۔ راجہ نے بادشاہ اور شاہ عالم کے درمیان صلح کرا دی۔ میر نے لکھا ہے کہ "میں اس تقریب سے تیس سال بعد آگرہ گیا"[۴۱] آگرہ میں اپنے والد اور منہ بولے چچا امان اللہ کے مزارات پر گئے۔ آگرہ کے شعرا انہیں امام فن سمجھ کر ملاقات کے لئے آئے[۴۲] لیکن اس بار یہاں آکر میر اس لئے خوش نہیں ہوئے کہ کوئی ایسا مخاطب نہ ملا جس سے بات کر کے دلِ بے تاب کو تسلی ہوتی۔

میر چار ماہ رہ کر سورج مل کے قلعوں میں واپس آگئے۔ یہاں آکر اطلاع ملی کہ انگریزوں نے ناظم بنگالہ میر قاسم کو شکست دیدی ہے۔ یہ ۱۱۷۸ھ / ۶۵-۱۷۶۴ء کا واقعہ ہے[۴۳]۔ عظیم آباد چونکہ نظامتِ بنگالہ کا حصہ تھا شجاع الدولہ نے شاہ عالم ثانی کو ساتھ لے کر انگریزوں پر فوج کشی کر دی۔ انگریزوں سے مقابلے میں شاہی افواج کو شکست ہوئی۔ بادشاہ حراست میں آگیا۔ انگریزوں نے معاہدہ کر کے بنگال، بہار، اڑیسہ کی سند اپنے نام لکھوالی اور بادشاہ کو الہ آباد میں

مقیم کر دیا۔

اسی زمانے میں سورج مل کے بیٹوں اور مرہٹوں میں جنگ چھڑ گئی۔ راجہ ناگر مل سورج مل کے قلعوں سے نکل کر آگرہ آگئے۔ میر بھی ان کے ہمراہ تھے۔ پندرہ دن رہ کر راجہ واپس آئے اور جاٹوں کی بڑھتی ہوئی شورش کو دیکھ کر، بیس ہزار اہل دہلی کے ساتھ، جو ان کی پناہ میں تھے، شہر کامان آگئے۔ میر بھی اس قافلے کے ساتھ تھے۔ ربیع الاول ۱۱۸۵ھ/جون ۱۷۷۱ء میں جب شاہ عالم الہ آباد سے فرخ آباد آئے تو راجہ ناگر مل نے میر کو حسام الدین خان کے پاس، جو اس وقت شاہ عالم کے مزاج میں دخیل تھے، روانہ کیا۔ میر نے حسام الدین خان سے مل کر عہد و پیمان کئے لیکن راجہ کے چھوٹے بیٹے نے باپ کو سمجھایا کہ دکھنیوں کے ساتھ ملنا زیادہ بہتر ہے۔ راجہ نے چھوٹے بیٹے کی بات مان لی۔ میر بہت بے آبرو ہوئے اور راجہ کے بڑے بیٹے رائے بہادر سنگھ کو سلے حالات سے باخبر کیا اور پھر راجہ ناگر مل کے ساتھ کامان سے دہلی آکر راجہ سے علیحدہ ہو گئے۔ اسی زمانے میں مرہٹوں کے سردار سندھیا بادشاہ کو لے کر ۲۹ رمضان ۱۱۸۵ھ/۶ جنوری ۱۷۷۲ء کو دہلی آئے اور بادشاہ کو مجبور کر کے نجیب الدولہ کے لڑکے ضابطہ خان پر ۱۹ ذی قعدہ ۱۱۸۵ھ/ ۲۴ فروری ۱۷۷۲ء کو سکرتال میں حملہ کر دیا۔ ضابطہ خان بھاگ گیا۔ مرہٹوں نے سارے اسباب پر قبضہ کر لیا۔ میر بھی راجہ ناگر مل کے بیٹے رائے بہادر سنگھ کے ہمراہ شاہی لشکر کے ساتھ تھے۔ مرہٹے چونکہ سب کچھ لے گئے رائے بہادر سنگھ کی مالی حالت بھی خراب ہو گئی اور میر کی حالت تو اور بھی ابتر ہو گئی۔ ذکر میر میں لکھا ہے:

"میں بھیک مانگنے کے لئے اٹھا اور شاہی لشکر کے ہر سردار کے در پر گیا۔ چونکہ شاعری کی وجہ سے میری شہرت بہت تھی لوگوں نے میرے حال پر خاطر خواہ توجہ کی۔ کچھ دن کٹے۔ ملی کی سی زندگی گذاری اور (آخر کار) حسام الدولہ کے چھوٹے بھائی وجیہہ الدین خان سے ملا۔ اس نے میری شہرت اور اپنی اہلیت کے مطابق تھوڑی بہت مدد کی اور بہت تسلّی دی"[44]

سکرتال سے دہلی واپس آکر میر خانہ نشین ہو گئے اور دوسروں کے سلوک پر زندگی

گزارنے لگے۔ بادشاہ بھی گاہ گاہ کچھ بھیج دیتے تھے۔ اس وقت میر کی عمر ۵۰ سال تھی اور ان کی ساری سرگرمیاں ادب و شعر تک محدود تھیں:

مصرعے گاہ گاہ می گویم
کارِ دنیائے من ہمیں قدر است[45]

اسی زمانے میں میر نے "ذکر میر" کو مکمل کیا۔

اگر ان سب حالات پر نظر ڈالی جائے تو اپنے والد کی وفات سے لے کر ۱۱۸۵ھ/۱۷۷۲ء تک میر نے زندگی میں پریشانیوں، افلاس، ویرانیوں اور خانہ جنگیوں کے علاوہ کچھ نہیں دیکھا۔ آسودگی نام کی کوئی چیز ان کی زندگی میں کبھی نہیں آئی۔

سمجھ کر ذکر کر آسودگی کا مجھ سے اے ناصح
وہ میں ہی ہوں کہ جس کو عافیت بیزار کہتے ہیں

عظیم مغلیہ سلطنت ان کی آنکھوں کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے ہوئی۔ احمد شاہ ابدالی کے حملے اور معاشرے پر ان حملوں کے اثرات کو میر نے اپنے باطن کے نہاں خانوں میں محسوس کیا۔ رعایت خان کی ملازمت سے لے کر ۱۱۸۵ھ/۱۷۷۲ء تک پچیس چھبیس سال کے عرصے میں میر زمانے کے انقلاب کی چکی میں پستے رہے اور زمانے کا شعور ان کے خون میں گردش کرتا رہا۔ ان سب اثرات نے ان کی شاعری کا مزاج، لہجہ اور آہنگ متعین کیا۔ اس دور میں ان کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز یہی تھا کہ وہ لے، جو میر کی شاعری کے ساز سے نکل رہی تھی، معاشرے کی بے چارگی، زمانے کے جبر اور حالات کی بے رخی کا اظہار کر رہی تھی۔ میر نے اپنے دور کی آواز کو اپنی شاعری میں خلاقانہ سطح پر اس طرح سمویا کہ اس آواز نے اپنے دور کی ترجمانی بھی کی اور اسے زماں و مکاں کی قید سے آزاد کر کے آفاقی سطح پر پہنچا دیا۔ ۱۱۸۵ھ/۱۷۷۲ء سے لکھنؤ جانے تک (۱۱۹۶ھ/۱۷۸۲ء) کا زمانہ بھی جسے میر نے خانہ نشینی کا زمانہ کہا ہے معاشی بدنصیبیوں کا زمانہ تھا۔ مستقبل غیر یقینی اور حال بے حال تھا۔ اہل ہنر ایک ایک کر کے دلّی چھوڑ رہے تھے، سودا اور سوز جا چکے تھے۔ شاہ حاتم نے شاہ تسلیم کے تکیے میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ درد مسندِ فقر پر بیٹھے تھے۔ دلی میں یہ عالم تھا کہ خود بادشاہ

وقت شاہ عالم بھی گدا تھا[ف۱]۔ وہ دوسروں کی کیا مدد کرتا۔ اہل ہنر کی سرپرستی کرنے والے امراء اس دنیا سے اٹھ چکے تھے اور جو تھے وہ خود دردیٹوں کے محتاج تھے۔ میر کی شاعری کی خوشبو سارے برعظم میں پھیل چکی تھی لیکن شاعر میر کی حالت خراب تھی۔ وہ دوسروں کی امداد پر زندگی گذار رہے تھے اور اس زندگی سے اتنے عاجز آچکے تھے کہ کوئی بھی ذرا سا سہارا دیتا تو وہ اُس کے پاس چلے جاتے۔ میر کے دل میں یہ خواہش ایک عرصے سے موجود تھی کہ وہ بھی لکھنؤ جا کر دربار اودھ سے وابستہ ہو جائیں۔ کلیات میر میں ایک مثنوی[۴۵] دربیان کدخدائی نواب آصف الدولہ بہادر" ملتی ہے۔ آصف الدولہ کی ایک ہی شادی ۱۱۸۳ھ/ ۱۷۶۹ء میں وزیر الملک نواب قمر الدین خان کی پوتی شمس النساء بیگم سے ہوئی تھی[۴۶]۔ میر کی یہ مثنوی اس چھپی ہوئی خواہش کا اظہار تھی۔ ۱۱۹۵ھ/ ۱۷۸۱ء میں سودا کی وفات کے بعد آصف الدولہ کو خیال آیا کہ اب میر کو بلوایا جائے۔ آصف الدولہ کے ماموں نواب سالار جنگ نے' ان پرانے روابط کے پیش نظر جو میر کے ماموں سراج الدولہ علی خان آرزو سے ان کے تھے' کہا کہ اگر نواب صاحب زادِ راہ عنایت فرمائیں تو میر ضرور آجائیں گے۔ جیسے ہی زاد راہ اور پروانہ ملا میر فوراً لکھنؤ کے لئے روانہ ہو گئے اور بھول گئے کہ دلّی سے لکھنؤ چلے جانے پر انہوں نے اپنے محسن اور ماموں کو اس بات پر کیسے نازیبا الفاظ کہے تھے[ف۲]۔ دلّی سے میر فرخ آباد پہنچے۔ رئیس فرخ آباد مظفر جنگ نے انہیں چھ روز ٹھہرنے کے لئے کہا لیکن وہ اتنی جلدی میں تھے کہ وہاں سے لکھنؤ آئے اور سیدھے سالار جنگ کے گھر پہنچے۔ چار پانچ دن بعد آصف الدولہ مرغ بازی کے لئے آئے۔ میر بھی وہاں موجود تھے۔ ملاقات ہوئی اور اپنے شعر سنائے۔ سالار جنگ نے نواب کو یاد دلایا۔ نواب نے

ف۔۱ ننگ نامہ (مثنوی) میں میر نے بھٹیاری کی زبان سے یہ شعر کہلوایا ہے:

ہو گدا جیسے شاہ عالم تم ۔۔۔ سو تو نکلے ہو کورے بالم تم

ف۲۔ وہ الفاظ یہ ہیں " خالوئے من بادیہ پیمائے طمع شدیعنی درلشکر شجاع الدولہ باین توقع رفت کہ برادران اسحاق خان شہید آن جا ہستند' نظر برحق سابق رعایت خواہند کرد' جز باد بدستش نیامد۔ لکدزمانہ خورد وہم آنجا مُرد' مُردۂ او را آوردند و درحویلیش بخاک سپردند" (ذکر میر ص ۷۵)

چند دن بعد میر کو بلوایا۔ میر نے قصیدہ پیش کیا اور ملازم ہو گئے[۴۷]۔ گلشن ہند کے مطابق تین سو روپے ماہوار مشاہرہ مقرر کرکے تحسین علی خان ناظر کے سپرد[۴۸] کیا اور سفینۂ ہندی کے مطابق دو سو روپے ماہوار مقرر ہوئے[۴۹]۔ بہرحال یہ اس بے روزگاری اور بائیس روپے ماہوار[۵۰] تنخواہ کے مقابلے میں' جو نواب بہادر جاوید خان کی سرکار سے میر کو ملتی تھی' ایک جاگیر کے برابر تھی۔

میر نے اپنے لکھنؤ آنے کا سال کہیں نہیں لکھا لیکن ذکر میر کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے[۵۱] کہ جب میر دلّی سے چلے اس وقت نجف خاں ذوالفقار الدولہ سخت بیمار تھے۔ لکھنؤ پہنچنے کے بعد میر نے نجف خاں کے مرنے کا ذکر کیا ہے "میرے ادھر آجانے کے بعد وہاں کہ نجف خاں بستر علالت پر تھے' فوت ہو گئے"[۵۲]۔ ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ پہنچنے کے کچھ عرصے بعد ہی نجف خاں (م ۲۲ ربیع الآخر ۱۱۹۶ھ[۵۳]/ ۶ اپریل ۱۷۸۲ء) کے مرنے کی اطلاع ملی۔ قاضی عبدالودود نے لکھا ہے کہ "نجف خاں اواخر صفر یا اوائل ربیع اول ۱۱۹۶ھ میں ذی فراش ہوئے۔ اس وقت میر دہلی میں تھے۔ ان کی وفات کی تاریخ ۲۲ ربیع الاخر ہے۔ اس وقت میر لکھنؤ میں تھے"[۵۴]۔ گویا میر ربیع الاول کے آخر یا ربیع الآخر ۱۱۹۶ھ میں لکھنؤ پہنچے اور اپنی زندگی کے باقی ۳۱ سال وہاں گزار کر ۱۲۲۵ھ/ ۱۸۱۰ء میں وفات پائی۔

اٹھارویں صدی عیسوی کے اس ماحول میں پراگندہ روزی' پراگندہ دل' بے دماغ اور انا پرست میر کے علاوہ کوئی اور ہوتا تو پس کر رہ جاتا لیکن میر نے وقت کی دھڑکن کو اپنے خون میں شامل کرکے اسے اپنی شاعری کے ساز میں سمو دیا۔ میر کی آواز اٹھارویں صدی کے برصغیر کی روح کی آواز ہے جس میں اس دور کے احساسات' امید و بیم' خوف و رجا، آس و یاس اور غم و الم شامل ہیں۔ میر کی شاعری ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہم اس دور کی روح کا عکس دیکھ سکتے ہیں لیکن میر کی شاعری کو سمجھنے کے لئے پہلے' ان حالات زندگی کی روشنی میں' ان کی شخصیت و سیرت کا بھی مطالعہ کر لیا جائے۔

(۲)

میر کی سیرت و شخصیت متضاد عناصر سے مل کر بنی تھی۔ ان کا گھر فقیر درویش کا گھر

تھا۔ باپ متقی اور پرہیزگار انسان تھے۔ توکل و قناعت شعار، سینہ آتشِ عشق سے روشن۔ اپنے بیٹے محمد تقی کو تلقینِ عشق کرتے اور کہتے:

"اے بیٹے عشق اختیار کر کہ (دنیا کے) اس کارخانے میں اسی کا تصرف ہے۔ اگر عشق نہ ہو تو نظمِ کل کی صورت نہیں پیدا ہو سکتی۔ عشق کے بغیر زندگی وبال ہے۔ دل باختۂ عشق ہونا کمال کی علامت ہے۔ سوز و ساز دونوں عشق سے ہیں۔ عالم میں جو کچھ ہے وہ عشق ہی کا ظہور ہے۔[۵۵]"

یہی وہ زاویہ ہے جس سے میر نے زندگی، انسان، معاشرے اور فرد کے رشتوں کا سراغ لگایا اور یہی وہ مرکزی نقطہ ہے جس سے ان کی شاعری کا دائرہ بنتا ہے۔

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور
نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور
محبت ہی اس کارخانے میں ہے
محبت سے سب کچھ زمانے میں ہے
محبت اگر کارپرداز ہو
دلوں کے تئیں سوز سے ساز ہو (مثنوی شعلۂ شوق)
عشق ہی عشق ہے نہیں ہے کچھ
عشق بن تم کہو کہیں ہے کچھ
عشق تھا جو رسول ہو آیا
ان نے پیغامِ عشق پہنچایا! (مثنوی معاملاتِ عشق)
عشق ہے تازہ کار تازہ خیال
ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال (مثنوی دریائے عشق)

یہی عشق ان کی شاعری کی تخلیقی روح ہے اور اسی سے ان کی سیرت و شخصیت کی تعمیر ہوئی ہے۔ میر کی شاعری اسی لئے عشقیہ شاعری ہے جس میں مقامیت بھی ہے اور آفاقیت بھی۔ ایسی شاعری اس سے پہلے نہ اردو میں ہوئی اور نہ میر کے بعد آنے والے

شعرا پر گہرے اثرات کے باوجود اس عشقیہ رنگ کی کوئی پیروی نہ کر سکا۔ یہ عشق کثافت بھی ہے اور لطافت بھی اور ان دونوں کے ملنے سے میر کی شاعری کا رنگ و آہنگ پیدا ہوا ہے۔

بچپن کے حالات و واقعات نے میر کی سیرت پر گہرے نقوش ثبت کئے تھے۔ ان کی تربیت ان کے منہ بولے چچا نے کی تھی۔ دس سال کے تھے کہ چچا کا اور گیارہ سال کے تھے کہ باپ کا انتقال ہو گیا۔ باپ نے تین سو روپے قرض چھوڑا۔ گیارہ سال کی عمر سے میر پر ذمہ داریوں کا ایسا بوجھ پڑا کہ وہ تلاشِ معاش میں لگ گئے۔ فکرِ معاش ان کے لئے غمِ زیست بن گیا۔

فکرِ معاش یعنی غمِ زیست تا بہ کے
مر جائیے کہیں کہ ٹک آرام پائیے

ایک طرف زندگی کی بنیادی ضرورتیں تھیں جن کو پورا کرنا میر کے لئے دشوار تھا اور دوسری طرف صدیوں پرانا معاشی، سماجی، سیاسی و تہذیبی نظام ان کی نظروں کے سامنے جان کنی کی حالت میں تھا۔ ذاتی غم اور زمانے کے غم نے حساس میر کو دریا در یا رلایا اور ان کی شاعری کو وہ نشتریت دی جو ان کی امتیازی صفت ہے۔ بے زری، اجڑا نگر، چراغِ مفلس، چراغِ گور، ویرانہ، صحرا، مرگ وغیرہ اسی کیفیت کے اشارے ہیں جو بار بار ان کی شاعری میں آتے ہیں۔

میر کے بارے میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی ذات کے نہاں خانے میں ایسے بند تھے کہ کبھی کھڑکی سے باہر آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ میر کی انا پرستی اور اپنی ذات کے احساسِ اہمیت کے باوجود یہ ایک ایسا یک طرفہ تصور ہے جو میر کی شخصیت و شاعری کے مطالعے کو ایک غلط راستے پر ڈال دیتا ہے۔ میر زمانے کی کشمکش سے الگ تھلگ رہ کر صرف اپنے غموں ہی میں محو نہیں رہے بلکہ وہ اس دور کے سیاسی واقعات کے عینی شاہد اور ان میں شریک تھے۔ ذکرِ میر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کی طوفان خیز لہروں پر بہتے کبھی ڈوبتے کبھی تیرتے رہے۔ انہوں نے وہ سب کچھ کیا جو ان حالات میں ایک آدمی کو کرنا چاہیئے تھا۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ میر سے زیادہ سفر اس دور کے کسی

شاعر نے نہیں کیا۔ ۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء سے لے کر ۱۱۸۵ھ/۷۲-۱۷۷۱ء تک تقریباً پچیس سال وہ مختلف امراء کے ملازم رہے مصاحبت کی، نوکری کی، سپاہی رہے، میدان جنگ میں گئے۔ سفارت کی، خدمت انجام دی، سفر کئے، مصائب اٹھائے، دکھ جھیلے، فاقہ کشی کی، دستِ سوال دراز کیا، چھپر میں رہے، بیٹے کو چھپر تلے دبتے دیکھا، دلّی کو بار بار لٹتے دیکھا، امیروں کو فقیر اور شاہ کو گدا بنتے دیکھا، بادشاہوں کی آنکھوں میں سلائیاں پھرتے دیکھیں، وارن ہیسٹنگز کی لکھنؤ میں آمد اور بیگماتِ اودھ پر اس کے ظلم و جبر کو دیکھا، مرہٹوں کی غارت گری، جاٹوں کی شورش، روہیلوں کی یورش سے مغلیہ سلطنت کی عظیم عمارت کو ڈھیر بنتے دیکھا۔ برعظیم میں انگریزوں کا اقتدار اور جنرل لیک کی فوجوں کا دہلی میں فاتحانہ داخلہ وہ واقعات ہیں جو میر کے سامنے ہوئے اور جس نے ان کے درپائے احساس کو متلاطم رکھا۔ میر نے ایک زندہ باشعور انسان کی طرح زندگی سے آنکھیں نہیں چرائیں بلکہ احساسِ زیست کو اپنی ذات کا حصہ بنا کر اپنے تخلیقی وجود میں اتار لیا وہ ایک زندہ انسان کی طرح عُرس اور میلے ٹھیلوں میں بھی نظر آتے ہیں[۵۶] ہم صحبتوں میں گپ شپ اور ہنسی مذاق بھی کرتے ہیں[۵۷] دوستوں اور معاصرین پر چُست کئے ہوئے فقروں سے لطف اندوز بھی ہوتے ہیں[۵۸] ذکرِ میر کے لطائف بھی اس دلچسپی کے شاہد ہیں[ف] میر دنیا سے بے تعلق نہیں تھے۔ اگر ہوتے تو وہ ایسی شاعری نہیں کر سکتے تھے جو آج بھی ہمارے لئے ایک زندہ تخلیقی عمل ہے۔ دلّی کے شاعروں میں میر نے وہ سارے کھیل کھیلے جو اپنی میریت کو قائم کرنے کے لئے ضروری سمجھے۔ نکات الشعرا میں وہ ایک گروہ بند شاعر نظر آتے ہیں۔ اپنے گروہ کے شاعروں کو چڑھاتے ہیں اور دوسرے گروہ کے شاعروں کو گراتے ہیں۔ "اژدر نامہ" لکھ کر انہوں نے دلّی کے سارے شاعروں کو دعوتِ پیکار دی جس میں اپنے سارے معاصر شاعروں

ف۔ "کتاب کے آخر میں میر صاحب نے کچھ لطیفے بھی جمع کر دیئے ہیں۔ بعض پرانے اور تاریخی ہیں اور بعض خود ان کے زمانے کے ہیں اور پُر لطف ہیں مگر افسوس کے بعض ان میں سے ایسے فحش ہیں کہ انکا لکھنا یا بیان کرنا ممکن نہیں ہے ..... یہ ایک غیر متعلق چیز تھی ہم نے یہ لطیفے کتاب سے خارج کر دیئے ہیں۔" (مقدمہ از عبدالحق ذکرِ میر، صفحہ ق) ہم نے کچھ لطیفے ذکرِ میر کے مطالعہ میں آئندہ صفحات میں درج کر دیئے ہیں..... (ج ج)

کو کیڑے مکوڑے اور خود کو اژدر بنایا جس نے منہ کھول جو سانس اندر لی تو سب کو ہڑپ کر کے میدان صاف کر دیا۔ صرف اژدر باقی رہ گیا۔ اس مثنوی کا جواب شاگردِ حاتم محمد امان نثار نے دیا، جس کا یہ شعر محفوظ رہ گیا ہے:

حیدرِ کرّار نے وہ زور بخشا ہے نثار
ایک دم میں دو کروں اژدر کے کلّے چیر کر

بقا نے "دو آبہ" کا مضمون اپنے شعر میں باندھا۔ میر نے بھی بعد میں دو آبہ کا مضمون اپنے شعر میں باندھا۔ بقا نے میر پر چوری کا الزام لگایا اور کہا:

میر نے ترا مضمون دو آبے کا لیا
پر بقا تو یہ دعا کر جو دعا دینی ہو
یا خدا میر کے دیدوں کو دو آبہ کر دے
اور بینی پہ بہا اس کی کہ تر بینی ہو

بقا نے "مینارِ میر" کے نام سے ایک مثنوی بھی لکھی جس میں دکھایا کہ میر صاحب چوری کے الزام میں پکڑے گئے ہیں اور "مینارِ میر" میں قید کر دیئے گئے ہیں۔ اس مینار کے بارے میں بقا نے بتایا کہ

یہ مینارِ دُزدِ بدافعال ہے
جو چوری کرے اس کا یہ حال ہے

میر نے بھی جوابی ہجویں لکھیں۔ بقا اور کمترین کی ہجویں، خاکسار سے اُن کی معرکے، اپنے اہم معاصرین شاہ حاتم اور یقین کے بارے میں پُر کینہ رائے، اپنے معاصرین کے اشعار پر اصلاحیں زندگی سے پوری دلچسپی لینے کی گواہی دیتی ہیں۔

میر کو شدید احساس تھا کہ وہ اتنے بڑے شاعر ہیں کہ ان کا کوئی ثانی نہیں ہے لیکن زمانے ان کی قدر نہیں کی۔ اسی احساس کے ساتھ وہ زمانے سے ٹکراتے رہے۔ لیکن واقعات بتاتے ہیں کہ اس پُر آشوب دور میں بھی معاشرے نے ان کی قدر کی جب رعایت خان نے میر سے میراثی کے لڑکے کو اپنے چند شعر یاد کرانے کے لئے کہا تو انہوں نے نوکری چھوڑ دی، لیکن

رعایت خان نے ان کی جگہ ان کے چھوٹے بھائی محمد رضی کو ملازم رکھ لیا۔ راجہ جگل کشور انہیں گھر سے بلا کر لے گیا۔ راجہ ناگر مل نے بگڑتے دنوں میں بھی ان کا خیال رکھا۔ بادشاہ وقت شاہ عالم بھی، مالی پریشانیوں کے باوجود، کبھی کبھی کچھ بھیج دیتا تھا۔ نواب بہادر جاوید خان کے وہ ملازم رہے لیکن گھوڑے اور تکلیف نوکری سے معافی رہی۔ یہ زمانہ ایسا غیر یقینی تھا کہ کوئی کچھ کرنا بھی چاہتا تو نہیں کر سکتا تھا۔ ان کی بے دماغی یا بد دماغی کا دور ۱۱۸۵ھ/۷۲-۱۷۷۱ء کے بعد شروع ہوتا ہے جب وہ معرکۂ سکرتال کے بعد دلّی آکر خانہ نشین ہو گئے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ پہلوان کی شخصیت پر غالب آتا گیا اور لکھنؤ پہنچ کر افسانہ بن گیا۔ تذکروں میں ان کی انانیت و خود پرستی کے جتنے واقعات درج ہیں وہ سب اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی شہرت سارے برعظیم میں پھیل چکی تھی اور بیشتر شاعروں کے چراغ ان کی شاعری کے سامنے گل ہو چکے تھے۔ مرزا مغل سبقت کو دیکھ کر یہ کہنا کہ تمہارے چہرے سے شعر فہمی معلوم نہیں ہوتی، سخن کو ضائع کرنے سے کیا حاصل، لکھنؤ جاتے ہوئے بینے کی طرف سے منہ پھیر کر بیٹھے رہنا اور سارے سفر میں اس سے بات نہ کرنا، شاہ قدرت سے یہ کہنا کہ دیوان کو اپنے دریا میں ڈال دو۔ آصف الدولہ کا پوچھنا کہ کیا مرزا رفیع سودا شاعر مسلّم الثبوت تھا اور میر کا جواب دینا "ہر عیب کہ سلطان بہ پسندد ہنر است"۔ وہ واقعات ہیں جو ۱۱۸۵ھ/۷۲-۱۷۷۱ء کے بعد کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ سب واقعات، خواہ ان میں افسانوی عنصر کتنا ہی شامل ہو گیا ہو، اس دور میں میر کی بڑھتی ہوئی انانیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ لکھنؤ آکر انہیں فراغت مزید نصیب ہوئی لیکن یہاں انہیں دلّی اور دلی کے کوچے یاد آتے رہے۔ لکھنؤ دلّی سے مختلف تھا۔ یہاں کی تہذیب میں گہرائی اور رچاؤ نہیں تھی اور میر ساری عمر خود کو لکھنؤ سے ہم آہنگ نہ کر سکے:

یارب شہر اپنا یوں چھڑایا تو نے — ویرانے میں مجھ کو لا بٹھایا تو نے
میں اور کہاں لکھنؤ کی یہ خلقت — اے وائے یہ کیا کیا خدایا تو نے

خرابہ دلّی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا
وہیں میں کاش مرجاتا سراسیمہ نہ آتا یاں (دیوان چہارم)

آباد اجڑا لکھنؤ چندوں سے اب ہوا
مشکل ہے اس خرابے میں آدم کے بود و باش (دیوان پنجم)

دلّی کے مقابلے میں لکھنؤ میر کے لئے ہمیشہ ایک ویرانہ ہی رہا۔

میر ایک مضطراب روح کے مالک اور منتشر زمانے کے نمائندہ فرد تھے۔ وہ آلام و مصائب، جنہوں نے میر کو اپنے زمانے نے نا مطمئن کیا، خود زمانے کے پیدا کئے ہوئے تھے۔ زمانے کے حالات و کوائف اور میر کی انانیت و انفرادیت کا ایک دوسرے پر عمل و ردِ عمل کا سلسلہ ساری عمر جاری رہا۔ ایک کو دوسرے کا سبب اور مسبب کہا جا سکتا ہے اور یہ کہنا مشکل ہے کہ کون پہلے ہے اور کون بعد میں۔ اگر برصغیر کی مغلیہ دور کی تاریخ کو دیکھا جائے تو میر کا زمانہ اس تہذیب و تمدن کی آخری سانس تھی۔ جو اکبر کے دور میں قائم ہوا تھا اور جس میں شاعری کی روایت فیضی و عرفی نے بنائی تھی۔ میر کے آخری زمانے میں لارڈ لیک مرہٹوں کو گھیرتا ہوا دلّی پہنچا تھا! اور لال قلعہ میں اکبر اعظم کے جانشین کو ایک پھٹے ہوئے شامیانے کے نیچے اندھا بیٹھا ہوا دیکھ کر افسردہ ہو گیا تھا اور اندھے بادشاہ کو اپنی حفاظت میں لے کر اس کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ بادشاہ کی آنکھوں میں سلائیاں پھرنے کا غم میر کا اپنا غم تھا۔ اس کے معنی یہ تھے کہ وہ آنکھ، جو معاشرے کی نگراں تھی، اب اندھی ہو چکی ہے۔ بادشاہ وقت کا پھٹے ہوئے شامیانے کے نیچے بیٹھنا اقتصادی بدحالی کا اشارہ تھا۔ بادشاہ کو حفاظت میں لے کر وظیفہ مقرر کرنا اس بات کا اشارہ تھا کہ سیاسی اعتبار سے اب مغلیہ سلطنت ختم ہو چکی ہے اور انگریزی اقتدار کی دست نگر ہے۔ میر کا دلّی سے لکھنؤ جانا اس بات کا اشارہ تھا کہ اس دم توڑتی ہوئی تہذیب کا پانی اب اس گڑھے میں مر رہا ہے۔ دلّی ایک وسیع و عریض سلطنت اور عظیم تہذیب کی علامت تھی، لکھنؤ ایک چھوٹے سے جزیرے کی محدود تہذیب تھی، جس سے میر کو سمجھوتا کرنا پڑا تھا۔ وہ زبان بھی جسے میر اپنی شاعری میں استعمال کرتے تھے اور جس کی سند وہ دلّی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں سے لیتے تھے، لکھنؤ میں بدل گئی تھی۔ ان سب تبدیلیوں نے میر کو مضطرب رکھا اور وہ لکھنؤ میں رہتے ہوئے بھی دلّی کو یاد کرتے رہے اور ان کی اداسی برقرار رہی۔

لکھنؤ دلّی سے آبایاں بھی رہتا ہے اداس
میر کی سرگشتگی نے بے دل وحیراں کیا (دیوان چہارم)

اس اداسی کا تعلق اگر معاشی فراغت سے ہوتا تو وہ میر کو لکھنؤ میں میسر تھی لیکن یہ ان کے لئے ایک پوری تہذیب کا مسئلہ تھا۔ لکھنؤ میں بھی شدت کے ساتھ وہ یہی محسوس کر رہے تھے کہ یہ بھی "شمع آخر شب" ہے۔ ان سب عوامل نے مل کر میر کی سیرت اور مزاج میں وہ کیفیت پیدا کر دی کہ انہوں نے اپنے غم میں سارے عالم کے غم کو محسوس کیا اور اس غم کو اردو شاعری کے روایتی اشاروں کے ذریعے بیان کر کے خود کو بھی تسکین دی اور دوسروں کے لئے بھی تسکین کا سامان بہم پہنچایا۔ اس طرح سارے معاشرے کا غم، ساری تہذیب کا المیہ ان کی شاعری کی آواز میں در آیا۔ میر نے اپنے دور کی اجتماعی روح کے کرب کو اپنی تخلیقی روح میں جذب کر کے اس پہاڑ جیسے المیے کو اپنی شاعری کے آہنگ میں سمو دیا۔ اسی لئے میر کا غم محض روایتی چیز نہیں ہے اور نہ وہ فرار کی ایک صورت ہے بلکہ زندگی کی حقیقت و صداقت کا اظہار ہے۔ دلّی جس کا ذکر بار بار ان کی شاعری میں آتا ہے وہ صرف کسی شہر کا نام نہیں بلکہ اس عظیم مرتی ہوئی تہذیب کی روح کا اشارہ ہے۔ غم جاناں اور غم دوراں میر کے ہاں مل کر ایک ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے کی ترجمانی کرتے ہیں۔

دھر کا ہو گلہ کہ شکوۂ چرخ
اس ستم گر ہی سے کنایت ہے

یہ بڑی اہم بات ہے کہ میر نے اس تہذیبی المیے کا اظہار فارسی زبان میں نہیں کیا۔ فارسی تو اس مٹتی ہوئی تہذیب کی زبان تھی جو اس تہذیب کے ساتھ ہی فنا کے گھاٹ اتر رہی تھی۔ میر نے اپنے تجربے اور احساس کا اظہار اس زبان میں کیا جو دورِ زوال میں روشن مستقبل کی نشان دہی کر رہی تھی، جس میں اس مٹتی ہوئی تہذیب کی روح بھی تھی اور عظیم کی مٹی کی باس بھی۔ میر نے اس زبان میں اپنی روح کو سمو کر اپنی شاعری اور زبان دونوں کو روشن کر دیا۔ اسی لئے انہیں اپنی شاعری کے مستقبل پر پورا اعتماد ہے ع تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا۔ میر نے اپنے تخلیقی عمل سے اس دور کے تہذیبی الم کو اپنی شاعری

میں سمو کر اس پر فتح حاصل کر لی اسی لئے میر اپنے دور کے سب سے بڑے نمائندہ شاعر ہیں۔ میر کی شاعری فارسی روایت کے گہرے اثرات کے باوجود خالص اردو شاعری کی ایک لازوال مثال ہے اور ہوا جس رخ سے چل رہی ہے میر کے مطالعے کی اہمیت روز بروز بڑھتی جائے گی۔

میر کی سیرت اور شخصیت کا یہ مطالعہ نامکمل رہ جائے گا اگر اختصار کے ساتھ میر کے ذہن کی ساخت کا مطالعہ بھی ساتھ ساتھ نہ کر لیا جائے۔ میر نے جن حالات میں زندگی گذاری ان سب کا اثر اپنے مخصوص طریقے پر محسوس کیا۔ سودا بھی انھیں حالات سے گزرے تھے لیکن وہ حالات سے سمجھوتہ کرتے رہے جب کہ میر سینہ سپر ہو کر ان کا مقابلہ کرتے رہے۔ یہ میر کے مزاج کا ایک رخ ہے۔ دوسرا رُخ ان کی حد درجہ بڑھی ہوئی انانیت سے پیدا ہوتا ہے جس میں وہی مرض پسندی (MORBIDITY) نظر آتی ہے جو انگریزی زبان کے رومانی شاعروں کا طرۂ امتیاز سمجھی جاتی ہے۔ ان کے والد ان کے چچا اور وہ خود شروع ہی سے ہیں نقطۂ اعتدال سے ہٹے ہوئے (ABNORMAL) نظر آتے ہیں۔ یہ ایب نارمل (ABNORMAL) رویہ اور یہ انانیت میر کو ورثے میں ملی تھی۔ میر کے چچا بچپن ہی میں خللِ دماغ سے وفات پا چکے تھے۔ میر بھی نوجوانی ہی میں مجنوں ہو گئے تھے۔ چاندنی رات میں ایک خوش پیکر کرۂ قمر سے ان کی طرف رخ کرتا اور بے خودی کا سبب بن جاتا۔ وہ جس طرف نظر اٹھاتے وہی رشکِ پری نظر آتی۔ ذکرِ میر میں تفصیل کیساتھ اس کو بیان کیا ہے اور مثنوی خواب و خیال میں اسی کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ نفسیاتی مطالعے کے لئے ان کی یہ دیوانگی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ ان کے مخصوص جذبات اور مخصوص نظر کا مخرج یہی دیوانگی ہے۔ طبیعت میں توازن کی کمی میر کو ورثے میں ملی تھی، اسی لئے وہ انتہائی حساس تھے۔ غموں اور پریشانیوں سے گہرا اثر لینا اور قنوطیت میں ڈوب جانا ایسے مزاج کا خاصہ ہوتا ہے:

ہوئی عید سب نے پہنے خوشی و طرب کے جامے
نہ ہوا کہ ہم بدلتے یہ لباسِ سوگواراں، (میر)

میر کے ہاں بھی اس غم کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ وہ ہر لمحہ درد و کرب کے عالم میں

رہتے ہیں اور دوسرے یہ کہ وہ دنیا زمانے کے شاکی ہیں۔ جلد دل برداشتہ ہو جاتے ہیں اور ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے۔ آلڈس ہکسلے نے لکھا ہے کہ انسانی دماغ دو قسم کی ساخت کے ہوتے ہیں۔ ایک قاتل کا دماغ اور دوسرا مقتول کا دماغ۔ پہلا دوسروں کو قتل کرنے کے لئے ہر دم تیار رہتا ہے اور دوسرا خود قتل ہو جانے کے لئے آمادہ رہتا تھا۔ میر کا دماغ دوسری قسم کا تھا۔ یہ دماغ زندگی بھر ان کی زندگی اور شاعری پر اثر انداز ہوتا رہا۔

جو راہِ دوستی میں اے میر مر گئے ھیں
سر دیں گے لوگ اون کے پائے نشان اوپر
پڑی بلا ہیں ستم کشتۂ محبت بھی
جو تیغ برسے تو سر کو نہ کچھ پناہ کریں

اسی ذہنی رجحان کے نفسیاتی مطالعے کے لئے ان کے عشق کا واقعہ بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ جیسے ہربرٹ ریڈ نے ورڈسورتھ کی شاعری کا نفسیاتی مخرج اس کی اس خجالت اور ملامتِ نفس (REMORSE) کو قرار دیا ہے جو اسے اپنی فرانسیسی محبوبہ کو چھوڑ دینے پر محسوس ہوئی تھی۔ اسی طرح میر کی شاعری کا مخرج بھی ان کا عشق اور اس سے پیدا ہونے والا جنون ہے جو نوجوانی میں ان پر سوار ہوا اور جس کا ذکر مثنوی "خواب و خیال" میں انہوں نے خود کیا ہے۔ احمد حسین سحر نے بھی اپنے تذکرہ میں میر کے عشق کی اس روایت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے کہ "مشہور ہے کہ اپنے شہر میں ایک پری تمثال سے کہ ان کی عزیزہ تھی، در پردہ عشق کرتا تھا۔"[۵۶] مثنوی خواب و خیال کے مطالعے سے ایک بات تو یہ سامنے آتی ہے کہ عشق میر کی گھٹی میں پڑا تھا۔ غم و افسردگی، دماغ کی اس مخصوص ساخت کی وجہ سے ان کا مانوس جذبہ تھا۔ غم روزگار سے وہ پہلے ہی افسردہ تھے۔ غم جاناں اس میں اور شامل ہو گیا۔ ان دو شدتوں نے مل کر انہیں مجنون کر دیا۔ قوتِ تخیل ان کی تیز تھی۔ انگریزی کے رومانی شاعر شیلی کی طرح میر کو کو بھی واہمے (HALLUCINATIONS) ہونے لگے اور چاند میں انہیں ایک شکل نظر آنے لگی۔ یہ تصویر ان کی فطری شاعرانہ صلاحیت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر جگر سوختہ کے آتش زدہ دل کا دھواں اس ایک صورت کو ہزار صورتوں میں

جنم دے رہا تھا۔ ذکرِ میر کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ خللِ اعصاب (NEUROSIS) کا طبی علاج فخر الدین کی بیگم نے کرایا اور موسم خزاں میں وہ صحت یاب ہو گئے لیکن "خوش معرکۂ زیبا" سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ایک علاج اور بھی ہوا جو خان آرزو نے یہ کہہ کر کیا کہ "اے عزیز دشنام موزوں دعائے ناموزوں سے بہتر اور رخت کے پارہ کرنے سے تقطیعِ شعر خوش تر ہے۔ چونکہ موزونی طبیعت جوہر ذاتی تھی جو دشنام زبان تک آئی مصرع یا بیت ہو گئی۔"[۵۷] تقطیعِ شعر پر الفاظ کو مرتب کرنا وہ مستقل علاج تھا جس سے کھویا ہوا توازن واپس آ گیا لیکن جہاں تک دماغ کی ساخت کا تعلق تھا وہ ویسا ہی رہا اور ایک آسیب و وھم (OBSESSION) ان کے ذہن پر ہمیشہ سوار رہا۔ احساسِ تنہائی، عزور و نخوت، انا و پندار، ذرا سی دیر میں بھڑک اٹھنا اسی مالیخولیہ کا لازمی حصہ ہیں۔ میر باطن بیں (INTROVERT) تھے اور شروعِ زندگی کی ناکامیاں اور نامرادیوں سے شدید احساس کمتری میں مبتلا ہو گئے تھے۔ جب سخن کی کرامت ہاتھ آئی تو یہ احساس کمتری ایک مثبت راستے پر لگ کر احساسِ برتری میں تبدیل ہو گیا۔ اس سطح پر وہ دوسروں کو خود سے کم تر اور اپنی شاعری پر اتنا فخر کرتے تھے کہ بادشاہ وقت بھی اگر پوری توجہ نہ دیتا تو بگڑ جاتے۔ میر کے کردار کی تعمیر انہیں اثرات سے ہوئی تھی اور ان کی شاعری اسی سیرت و مزاج کی آئینہ دار ہے۔ شیلی (SHELLY) کے دماغ کی ساخت بھی میر کے دماغ کی طرح تھی۔ میر کی طرح شیلی کے ہاں بھی غم کی لے دل کے تاروں کو چھوتی ہے۔ میر کہتے ہیں:

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

شیلی کہتا ہے:

CRADLED INTO POESY BY WRONG
WE LEARN IN SUFFERING WHAT WE
TEACH IN SONG

لیکن میر نے اپنی شاعری میں صرف درد و غم ہی جمع نہیں کئے بلکہ غموں کو ہضم کر کے

اسے ایک مثبت صورت بھی دے دی۔ ان کا فلسفہ غم، صبر اور تعلیم و رضا کے ذریعے انسان کو غم و نشاط سے بلند اٹھا دیتا ہے۔ یہی وہ صوفیانہ انداز نظر تھا جو میر کو بچپن میں اپنے باپ اور چچا سے ملا تھا اسی لئے میر کے غم میں ایک ٹھہراؤ ہے۔ اس میں ایک ایسی علویت ہے کہ ان کے شعر دلوں میں اتر جاتے ہیں اور حیات و کائنات اور انسان کے بارے میں ایک نیا شعور پیدا کرتے ہیں۔ یہی وہ کمال ہے جو میر کو خدائے سخن بنا دیتا ہے۔ میر کے سامنے انسان، حیات و کائنات کا ایک عینی معیار ہے، اسی لئے وہ انسان اور زندگی کسی سے مطمئن نہیں ہوتے۔ یہی بے اطمینانی انہیں تلاشِ خوب تر میں سرگرداں اور مضطرب و بے قرار رکھتی ہے۔ اسی بے اطمینانی کی وجہ سے میر آخر وقت تک تخلیقی سطح پر تازہ دم رہے۔

(۳)

پراگندہ روزی اور پراگندہ دل ہونے کے باوجود میر نے نہ صرف چند دواوین پر مشتمل اپنا ضخیم کلیاتِ اردو، جس میں بیشتر اصنافِ سخن موجود ہیں، یادگار چھوڑا بلکہ فارسی دیوان کے علاوہ فارسی نثر میں اردو شعرا کا تذکرہ نکات الشعرا، فیضِ میر، دریائے عشق اور ذکرِ میر بھی تصنیف کیے۔

نکات الشعرا جس کا سال تکمیل ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء ہے، ایک اہم تذکرہ ہے جس میں ۱۰۳[۶۱] اردو شاعروں کے مختصر حالات کے ساتھ ان کے کلام کا انتخاب دیا گیا ہے۔ قاضی عبد الودود صاحب نے شمار کر کے بتایا ہے کہ نکات الشعرا میں منتخب اشعار کی تعداد ۱۲۵ ہے اور اگر مخمس کے دو بند اور دو مصرعے شامل کر لئے جائیں تو اس طرح اشعار کی تعداد ۱۲۶۰ ہو جاتی ہے۔ میر نے سب سے زیادہ اپنے شعر دیئے ہیں جن کی تعداد ۲۸۴ ہے جبکہ دو شاعر سجاد اور سودا ایسے ہیں جن کے علی الترتیب ۱۱۲ اور ۱۰۱ اشعار دیئے ہیں۔ تین شاعر درد، کلیم اور قائم ایسے ہیں جن کے اشعار کی تعداد ۱۰۰ اور ۵۱ کے درمیان ہے۔ درد کے ۹۳، کلیم کے ۶۷ اور قائم کے ۵۱ شعر دیئے ہیں۔ ۷ شعرا ایسے ہیں جن کے اشعار کی تعداد ۵۰ اور ۲۲ کے درمیان ہے۔ ابرو ۴۷، تاباں ۴۷، یکرنگ ۴۶، یقین ۴۲، محسن ۳۲، حاتم

۱۷، راقم ۲۷۔ ۷ شاعر ایسے ہیں جن کے اشعار کی تعداد ۲۵ اور ۱۱ کے درمیان ہے۔ ناجی ۲۵، ولی ۲۲، مضمون ۱۸، عزلت ۱۸، شوق ۱۷، سراج ۱۳، خاکسار ۱۲۔ باقی ۸۴ شاعروں کے سلسلے میں صرف ۱۸۶ اشعار منتخب کیے گئے ہیں جن میں دردمند، مظہر، ہدایت، ذکی، فغان، قدرت اور بیدار جیسے شعرا بھی شامل ہیں۔[۶۲]

"نکات الشعرا" کا سن تصنیف کہیں درج نہیں ہے لیکن اندرونی شواہد سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ میر کا یہ تذکرہ موجودہ صورت میں ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء میں زیرِ تصنیف تھا۔ نکات الشعرا میں انند رام مخلص کے ذیل میں لکھا ہے کہ

"مدت سے دمہ کا مریض تھا۔ تقریباً ایک سال ہوا کہ فوت ہو گیا۔"[۶۳]

"نشترِ عشق" کے مطابق مخلص کا سال وفات ۱۱۶۴ھ/۱۷۵۱-۵۰ء ہے[۶۴] جس کی تائید سبھگوان داس ہندی کے تذکرے سے بھی ہوتی ہے جس میں لکھا ہے کہ "احمد شاہ بن فردوس آرام گاہ کے چوتھے سال بمرض دمہ وفات پائی۔"[۶۵] احمد شاہ جمادی الاول ۱۱۶۱ھ/اپریل ۱۷۴۸ء میں تخت پر بیٹھا۔ اس کی حکومت کا چوتھا سال جمادی الاول ۱۱۶۴ھ سے ۱۱۶۵ھ تک ہوتا ہے۔ اس حساب سے "نکات الشعرا" ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء میں لکھا جا رہا تھا۔ اور یہ کہ مخلص کا حال میر نے ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء میں لکھا۔

سید عبدالولی عزلت کے ذیل میں میر نے لکھا ہے کہ

"حال ہی میں وارد ہند کہ جس سے شاہجہان آباد مراد ہے، ہوئے ہیں۔"[۶۶]

غلام علی آزاد بلگرامی کے مطابق عزلت "۲۲ جمادی الاول ۱۱۶۴ھ/۷ اپریل ۱۷۵۱ء بلدۂ فاخرہ میں داخل ہوئے اور اس تحریر کے وقت تک وہیں ہیں۔"[۶۷] تذکرہ "سرو آزاد" ۱۱۶۶ھ/۱۷۵۲-۵۳ء میں مکمل ہوا۔[۶۸] "اس تحریر کے وقت تک وہیں ہیں۔" کے الفاظ سے پتا چلتا ہے کہ آزاد نے عزلت کا حال جمادی الاول ۱۱۶۴ھ کے کافی بعد لکھا ہے، لیکن نکات الشعرا کے الفاظ "تازہ وارد ہندوستان" سے معلوم ہوتا ہے کہ عزلت کا حال میر نے ۱۱۶۴ھ/۱۷۵۱ء میں لکھا ہے۔ اسی طرح نکات الشعرا میں مرزا اگرامی کے ذیل میں لکھا ہے کہ "ان کے حالات تذکرۂ خان صاحب میں مرقوم ہیں۔"[۶۹] اور مخلص کے ذیل میں لکھا ہے کہ "ان کے حالات

تذکرۂ خان صاحب میں مفصل لکھے ہیں۔" آرزو نے اپنا تذکرہ "مجمع النفائس" ۱۱۶۴ھ میں مکمل کیا۔" گویا یہ تذکرہ میر کی نظر سے ۱۱۶۴ھ/۱۷۵۰-۵۱ء یا اس سے قبل گذرا جب کہ وہ "نکات الشعرا" تالیف کر رہے تھے۔

شاہ حاتم کے ذیل میں میر نے جو انتخاب کلام دیا ہے وہ "دیوان قدیم" سے کیا گیا ہے۔ وہ دیوان جو میر کی نظر سے گذرا صرف ردیف میم تک تھا۔[۲] "دیوان قدیم" کے بارے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ یہ پہلی بار ۱۱۴۴ھ/۳۲-۱۷۳۱ء میں مرتب ہوا لیکن اس کے بعد بھی حاتم اس میں مسلسل اضافے کرتے رہے۔ انتخاب کے آخری شعر سے پہلا شعر جو زمین طرحی میں ہے:

دلوں کی راہ خطرناک ہو گئی آیا
کہ چند روز سے موقوف ہے سلام و پیام

"دیوان زادہ" نسخۂ لاہور[۳] میں ۱۱۶۴ھ کے تحت درج ہے اور نسخۂ رامپور میں[۴] ۱۱۶۱ھ کے تحت درج ہے اگر ۱۱۶۴ھ درست ہے تو اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ حاتم کا تذکرہ میر نے ۱۱۶۴ھ/۵۱-۱۷۵۰ء میں لکھا اور اگر ۱۱۶۱ھ/۴۸-۱۷۴۷ء صحیح ہے تو پھر حاتم کا ذکر اس سال لکھا گیا۔

ذکی کے ذیل میں میر نے لکھا ہے کہ

"محمد شاہ بادشاہ نے اس سے مثنوی حقہ کی فرمائش کی تھی۔ دو تین شعر موزوں کئے مگر اس سے تکمیل نہ ہو سکی۔ اب شیخ محمد حاتم نے جن کا ذکر کیا گیا اسے مکمل کیا۔"[۵]

لفظ "اب" (اکنوں) سے جناب امتیاز علی عرشی نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ نکات الشعرا کی یہ عبارت محمد شاہ متوفی ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء کی زندگی میں یا اس کے انتقال سے کچھ بعد لکھی گئی۔ یہ بات اس لئے قرین قیاس نہیں ہے کہ مثنوی "وصف تمباکو و حقہ" ۱۱۴۹ھ/۳۷-۱۷۳۶ء میں لکھی گئی اور اس وقت میر کی عمر چودہ سال تھی۔ اس بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ "نکات الشعرا" اپنی موجودہ صورت میں ۱۱۶۵ھ/۵۲-۱۷۵۱ء تک لکھا جا رہا تھا اور

غالباً اسی سال ختم ہوا۔ اس وقت وہ نواب بہادر جاوید خان کے ملازم تھے۔ گھوڑا اور تکلیف نوکری سے معافی تھی" اور تنخواہ کی نوعیت و وظیفے کی تھی۔ یہ فراغت انہیں بہت زمانے کے بعد میسر آئی تھی۔

اس سلسلے میں ایک بات اور قابل توجہ ہے۔ میر کے تذکرے کا ذکر مختلف تذکروں میں آیا ہے اور ان میں بعض حوالے ایسے ہیں جن کا ذکر موجودہ نکات الشعرا میں نہیں ہے مثلاً

۱۔ قاسم نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ "اپنے تذکرے میں ہر شخص کو برائی سے یاد کیا ہے۔ شاعر شان جلی المتخلص بہ ولی کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ شیطان سے زیادہ مشہور تر ہے۔"[۸] یہ بات موجودہ نکات الشعرا میں نہیں ہے۔ قاسم نے یہ بھی لکھا ہے کہ اسی لئے "اس کردار ناہنجار کو کمترین نامی شاعر کی طرف سے مناسب سزا مل گئی کہ جس نے اس کی متعدد ہجویں لکھی ہیں۔ ان میں سے بعض نہایت رکیک اور عریاں ہیں۔"[۹] اور "اس ابلیس فطرتی اور شیطنت مزاجی کے جواب میں میر خان کمتریں نے خدا اس کی مغفرت کرے، بہت سی نظمیں حسب موقع اور بجا لکھی ہیں کہ ع ولی پر جو سخن لاوے اسے شیطان کہتے ہیں۔"[۱۰]

۲۔ مروان علی خان مبتلا نے جنون کے ذیل میں لکھا ہے کہ "یہ اشعار میر محمد تقی کے تذکرے سے نقل کئے گئے ہیں۔"[۱۱] لیکن شیخ غلام علی جنون کا کوئی ذکر متداول نکات الشعرا میں نہیں ہے۔

۳۔ خواجہ احسن اللہ بیان مرزا مظہر جانجاناں کے شاگرد تھے۔ شفیق نے چمنستان شعرا میں جو انتخاب کلام دیا ہے وہ تذکرۂ ریختہ گویاں اور نکات الشعرا سے لیا گیا ہے۔ شفیق نے خود لکھا ہے کہ "یہ اشعار دونوں تذکروں سے تحریر کئے جاتے ہیں۔"[۱۲] اور اس کے بعد ۶۲ اشعار دیئے ہیں۔ تذکرہ ریختہ گویاں میں بیان کے ۱۹ اشعار ہیں جن میں ۱۷ شعر چمنستان شعرا میں موجود ہیں۔ دو شعر گردیزی اور نکات الشعرا میں مشترک ہیں ۔۔ اس حساب سے شفیق نے باقی ۴۵ اشعار نکات الشعرا سے لئے ہیں، لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ متداول نکات

الشعرا میں سرے سے بیان کا ذکر ہی نہیں ہے۔

ان باتوں سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ میر کے نکات الشعرا کا ایک نقشِ اول بھی تھا جس میں ایسے شاعروں کا ذکر بھی تھا جو متداول نکات الشعرا میں شامل نہیں ہیں اور جس میں اپنے معاصرین اور دوسرے شعرا کے بارے میں میر نے ایسی باتیں لکھی تھیں کہ وہ انہیں پڑھ کر چراغ پا ہو گئے تھے۔ اسی لئے شفیق نے انہیں "گل سرسبد.... پر حرف گیری کرتا ہے اور اس کے عجیب و غریب کمال پر تذکرہ نکات الشعرا من تصنیف میر گواہ ہے"[۸۳] لکھا ہے۔ قاسم کے مجموعۂ نغز کا حوالہ اوپر آ چکا ہے۔ تذکرۂ شورش اور تذکرۂ مسرت افزا میں بھی میر کی نکتہ چینی، اعتراض اور حقارت سے شعرائے ریختہ کا حال درج کرنے کا ذکر موجود ہے۔

میر محمد بار خاکسار نے میر کے "نکات الشعرا" (نقشِ اول) کے جواب میں ایک تذکرہ "بنام معشوق چہل سالہ خود" لکھا تھا۔ جس کا ذکر میر نے متداول نکات الشعرا[۸۴] میں کیا ہے قائم نے خاکسار کے مزاج کے بارے میں لکھا ہے کہ "اگرچہ ہر استاد و غیر استاد کے ساتھ اس کی شوخیاں بطور مزاح ہوتی ہیں لیکن اس کی تمکنت جواب سننے کی تاب نہیں لاتی"[۸۵] خاکسار کا تعلق مرزا مظہر جانجاناں سے تھا اور اتنا کہ میر کے الفاظ میں "ہر بات میں مرزا جان جاں مظہر کی تقلید کرتا ہے"[۸۶]۔ مصحفی نے خاکسار کے بارے میں لکھا ہے کہ "از ہندی گویانِ قدیم است" اور بتایا ہے کہ "میر تقی میر عالم شباب میں اس کا منظورِ نظر تھا"[۸۷]۔ کریم الدین نے بھی اس کی تائید کی ہے اور خاکسار کو میر کا استاد لکھا ہے۔ کریم الدین کے الفاظ یہ ہیں: "میر تقی میر لڑکپن میں جب شعر کہتا تھا، خاکسار اس کو اصلاح دیا کرتا تھا"[۸۸]۔ ممکن ہے آرزو کی طرح میر نے بھی خاکسار کی استادی سے انکار کیا ہو اور یہیں سے تعلقات میں خرابی پیدا ہو گئی ہو اور پھر جو کچھ معرکہ ہوا اس کا سبب یہی ہو۔ بہرحال اس جوابی تذکرے میں، جو اب معدوم ہے خاکسار نے میر پر ایسے حملے کئے تھے جس پر بگڑ کر میر نے لکھا کہ "بہت کمینہ پن کرتا ہے.... چنانچہ اس تذکرے کے جواب میں ایک تذکرہ لکھا ہے بنام معشوق چہل سالہ خود اور اس میں سب سے پہلے اپنا حال درج کیا ہے اور اپنا خطاب سید الشعرا قرار دیا ہے۔

آتش کینہ بے سبب اتنی تیز ہے کہ اس سے کباب کی سی بو آتی ہے"[۸۹]۔

صفدر آہ نے لکھا ہے کہ یہ پُراشتعال تذکرہ ۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء میں میر نے لکھا تھا جس کے جواب میں خاکسار نے اپنے تذکرہ تالیف کیا گردیزی کے تذکرہ کا محرک بھی ایک طرح سے نکات الشعرا کا نقشِ اول ہے۔ نقشِ اول کا اس لئے کہ میر کا تذکرہ ۱۱۶۵ھ میں لکھا جا رہا تھا اور غالباً اسی سال اختتام کو پہنچا جب کہ گردیزی کا تذکرہ ۱۱۶۵ھ کے ۵ دن بعد یعنی ۵ محرم ۱۱۶۶ھ/۱۲ نومبر ۱۷۵۲ء کو پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ ظاہر ہے کہ گردیزی کا یہ تذکرہ متداول نکات الشعرا کا جواب نہیں ہو سکتا بلکہ نکات الشعرا کے نقشِ اول کا جواب ہوگا۔ گردیزی نے تذکرہ کا سبب تالیف یہ بتایا ہے کہ

"برادرانِ عصر کے تذکروں سے کہ جن میں معاصر ریختہ گویوں کے نام شامل کئے گئے ہیں ان کی اصل غرض ان تصانیف سے یہ ہے کہ ہمعصروں پر نکتہ چینی اور معاصرین کے ساتھ ستم ظریفی کی جائے۔ اکثر نازک خیال شاعروں کو لکھنے سے چھوڑ دیا جائے"[۹۲]

گردیزی نے اپنے تذکرے کے محرکات میں دو باتوں پر زور دیا ہے۔ اولاً یہ کہ ہمعصران کی خوردہ گیری اور معاصرین کے ساتھ ستم ظریفی تذکرہ نویسوں کا شعار رہا ہے۔ ثانیاً یہ کہ ان میں اکثر نازک خیال شعرا کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ یہ اشارہ میر کے تذکرے کی طرف ہے۔ دراصل خوردہ گیری اور نظر انداز کرنے کی وجہ شعرائے دہلی کی گروہ بندی تھی۔ ایک گروہ مرزا مظہر کے شاگردوں پر اور دوسرا سراج الدین علی خان آرزو کے شاگردوں پر مشتمل تھا۔ میر اس وقت تک آرزو کے حلقے میں تھے اور گردیزی مرزا مظہر کے۔ درد اور ان کا حلقہ دونوں کے ساتھ تھا۔ میر نے اپنے تذکرے میں حلقۂ مظہر کے بہت سے شعرا کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اور جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا ان کا ذکر خوردہ گیری کے ساتھ کیا تھا۔ اس وقت یقین مظہر کے اہم شاگرد تھے۔ میر نے ان کی خوب خبر لی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یقین تو شعر بھی نہیں کہہ سکتے۔ مرزا مظہر لکھ کر انہیں دیدیتے ہیں۔ ڈاکٹر محمود الٰہی نے لکھا ہے کہ "میر نے صرف یہی نہیں کیا کہ احسن اللہ بیان، خواجہ محمد ظاہر خان ظاہر، شیو سنگھ ظہور، سیتا رام عمدہ اور سلسلۂ مظہر

جانِ جاں کے بعض دوسرے شعرا کا ذکر نہیں کیا بلکہ انعام اللہ خان یقین، میر محمد باقر حزیں اور محمد فقیہہ دردمند کے ساتھ انصاف نہیں کیا ...... میر نے چُن چُن کر اس حلقے کے شعرا کو ہدفِ طعن و تشنیع بنایا ..... (میر کا) یہ تذکرہ محض معاصرانہ چشمک کی وجہ سے منصۂ شہود پر آیا، ورنہ میر کی تنقیدی بصیرت ایسی نہیں تھی کہ وہ میاں جگن اور میر گھاسی کی تعریف کرتے اور بندرابن راقم اور قدرت اللہ قدرت کی تنقیص[93]۔" یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ گردیزی نے اسی کدورت کی وجہ سے میر کا ذکر سرسری طور پر ۵ سطروں میں کیا ہے اور صرف ایک شعر انتخاب میں دیا ہے جب کہ یقین کا حال اور ان کا انتخاب کلام ۱۹ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

جس زمانے میں نکات الشعرا لکھا گیا اور پایۂ تکمیل کو پہنچا اسی زمانے میں اور بھی کئی تذکرے لکھے گئے جن میں مجمع النفائس، گلشنِ گفتار، تحفۃ الشعرا، تذکرۂ ریختہ گویاں اور مخزنِ نکات کے نام آتے ہیں۔ مجمع النفائس مولفہ سراج الدین علی خان آرزو ۱۱۵۷ھ/۱۷۴۴ء میں شروع ہوا اور ۱۱۶۴ھ/۵۱-۱۷۵۰ء میں مکمل ہوا[94]۔ یہ صرف فارسی گو شعرا کا تذکرہ ہے۔ "گلشن گفتار" خواجہ خان حمید اورنگ آبادی نے فارسی زبان میں ۳۰ ریختہ گو شاعروں کا حال لکھا ہے جو ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء میں مکمل ہوا۔ "گلشن بزم گفتار ہے" کے آخری چار الفاظ سے ۱۱۶۵ھ برآمد ہوتا ہے[95]۔ مرزا افضل بیگ خان قاقشال نے بھی اپنا تذکرہ "تحفۃ الشعرا" ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء میں مکمل کیا جس کا قطعہ تاریخ تالیف غلام علی آزاد بلگرامی نے لکھا اور اس کے آخری مصرعے کے آخری تین لفظوں سے ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء نکلتے ہیں: ع می شود تاریخ سالش "تحفۂ اصحاب شعر"[96]۔ عارف الدین خان عاجز نے "قطعہ ادج کلام شعرا"[97] (۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء) سے اس تذکرہ کا سالِ تالیف نکالا۔ اس میں ۹۲ شاعروں کا تذکرہ ہے اور یہ وہ شاعر ہیں جو یا تو فارسی میں کہتے تھے یا پھر فارسی کے ساتھ اردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ ان میں مرزا مظہر کے علاوہ وہ شعرا ہیں جو آصف جاہ اول (م ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) اور ناصر جنگ (م ۱۱۶۴ھ/۱۷۵۰ء) کے عہد میں موجود تھے۔ گلشن گفتار اور تحفۃ الشعرا کے بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ ۱۱۶۵ھ

میں لکھے گئے اس لئے ان کو اولین تذکروں میں شمار کرنے میں کوئی تامل نہیں ہے۔ "نکات الشعرا" کے بارے میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اس کا نقشِ اول ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء سے بہت پہلے تقریباً ۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء میں لکھا جا چکا تھا اور بعد میں میر نے قطع و برید اور حک و اضافہ کے بعد اسے موجودہ شکل میں ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء میں یا اس کے کچھ بعد مکمل کیا۔

سید فتح علی حسینی گردیزی (م ۵ شعبان ۱۲۲۴ھ/۱۶ ستمبر ۱۸۰۹ء[98]) نے اپنا تذکرہ ریختہ گویاں" ۵ محرم ۱۱۶۶ھ/۱۲ نومبر ۱۷۵۲ء کو ختم کیا، لیکن اس کا آغاز ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء کے قریب ہو چکا تھا اور اس کے بعد بھی ۱۱۷۰ھ/۵۷-۱۷۵۶ء تک اس میں اضافے ہوتے رہے[99]۔ یہی صورت قائم چاندپوری کے "مخزنِ نکات" کے ساتھ ہے۔ "مخزنِ نکات" اس کا تاریخی نام ہے جس سے ۱۱۶۸ھ/۵۵-۱۷۵۴ء برآمد ہوتا ہے۔ ۱۱۶۸ھ اس تذکرے کا سالِ تکمیل ہے اور اس کے بعد بھی ۱۱۷۶ھ/۶۳-۱۷۶۲ء تک اس میں اضافے ہوتے رہے لیکن قائم نے "مخزن نکات" ۱۱۶۸ھ سے گیارہ سال پہلے لکھنا شروع کر دیا تھا اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ اشتیاق کے بارے میں قائم نے لکھا ہے کہ "سات سال ہوئے ہوں گے کہ دارالبقا کو سدھار گئے[100]۔" اشتیاق کا انتقال "نشترِ عشق" اور "صبح گلشن" کے مطابق ۱۱۵۰ھ/۳۸-۱۷۳۷ء میں ہوا[101]۔ اس طرح اشتیاق کا تذکرہ قائم نے ۱۱۵۷ھ میں لکھا۔ قائم نے شرف الدین مضمون کے بارے میں لکھا ہے کہ "مدت دس سال کی ہوئی کہ طبعی موت سے مر گئے[102]۔" مضمون کا سالِ وفات، جیسا کہ تاباں کے قطعہ تاریخ وفات سے معلوم ہوتا ہے، ۱۱۴۷ھ/۳۵-۱۷۳۴ء ہے[103]۔ اس حساب سے مضمون کا تذکرہ بھی قائم نے ۱۱۵۷ھ میں لکھا[104]۔ اسی لئے قائم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ "اب تک شعرائے ریختہ کے حالات و کلام کے بارے میں کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی اور اس وقت کسی شخص نے اس فن کے سخنوروں کے ماجرائے شوق افزا کی بابت ایک سطر بھی نہیں لکھی[105]۔"

یہی دعویٰ نکات الشعرا میں محمد تقی میر نے کیا ہے کہ

"پوشیدہ نہ رہے کہ فن ریختہ میں، جو اردوئے معلی شاہجہان آباد

کی زبان میں بطور شعر فارسی لکھا جاتا ہے' کوئی کتاب اس وقت تک نہیں لکھی گئی ہے جس سے اس فن کے شاعروں کے حالات صفحۂ روزگار پر باقی رہیں۔ اس بنا پر یہ تذکرہ موسومہ نکات الشعرا لکھا جاتا ہے۔"[106]

دلچسپ بات یہ ہے کہ قائم نے میر کے ذکر میں یہ بھی لکھا ہے کہ "چونکہ بندہ کے گھر کے قریب رہتے ہیں۔ اکثر ملاقات کا اتفاق ہوتا ہے"[107]۔ میر نے نکات الشعرا میں لکھا ہے کہ "با فقیر نیز آشنا است"[108]۔ اس کے باوجود میر و قائم دونوں نے اولیت کا دعویٰ کیا ہے۔ دونوں کے تذکروں کے ناموں میں لفظ "نکات" مشترک ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میر نے اپنا متداول تذکرہ ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء میں ختم کر کے اسے شائع کر دیا۔ قائم نے اپنا تذکرہ ۱۱۵۷ھ/۱۷۴۴ء میں شروع ضرور کر دیا تھا لیکن یہ ۱۱۶۸ھ/۵۵-۱۷۵۴ء میں مکمل ہوا اور ۱۱۷۶ھ/۶۳-۱۷۶۲ء تک اس میں اضافے ہوتے رہے۔ یہی صورت گردیزی کے ساتھ ہے کہ ان کا تذکرہ ۱۱۵۶ھ/۱۷۴۳ء میں شروع ضرور ہوا لیکن یہ بھی ۱۱۶۶ھ کے پہلے مہینے کی پانچ تاریخ (۱۲ نومبر ۱۷۵۲ء) کو مکمل ہو کر شائع ہوا۔ اس لئے شمالی ہند کے تذکروں میں نکات الشعرا کو اولیت حاصل ہے۔ پھر یہ تذکرہ اردو کے ایک عظیم شاعر کی تصنیف ہے جس کی مدد سے ہم اس کے مزاج، کردار، شخصیت، اندازِ فکر، معیارِ شاعری، تنازعات اور معرکوں وغیرہ سے واقف ہوتے ہیں۔ اس لئے "نکات الشعرا" کی اہمیت ہمارے لئے اور بڑھ جاتی ہے۔

فنِ تذکرہ نویسی کے لحاظ سے "نکات الشعرا" معیاری فارسی تذکروں کے پائے کا نہیں ہے۔ اس تذکرے میں کوئی ترتیب نہیں ہے۔ اسے نہ تو حروفِ تہجی کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے اور نہ موضوع یا زمانے کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس میں وہ ترتیب بھی نہیں ہے جو "مخزنِ نکات" میں ملتی ہے جس میں سارے تذکرہ کو "طبقات" میں تقسیم کر کے پہلی بار اردو شاعری کو ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر دور کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ نکات الشعرا میں شعرائے دکن کو "پر بے رتبہ"[109] کہہ کر میر نے کوئی اہمیت نہیں دی ہے۔ اس میں ولی دکنی کا تذکرہ صرف چھ سطروں میں لکھا ہے اور بیشتر شاعروں کے بارے میں کچھ لکھے بغیر صرف ایک ایک شعر دے دیا ہے۔ شعرائے دکن کے سلسلے میں میر نے عبدالولی عزلت کی بیاض[110]

سے استفادہ کیا تھا۔ اگر وہ ان شاعروں کی حقیقی اہمیت سے واقف ہوتے تو عزلت سے، جو خود اس وقت تک دہلی میں موجود تھے، بہت سی باتیں دریافت کر کے تذکرے میں شامل کر سکتے تھے۔ میر نے اس اعتراف کے باوجود کہ "اگرچہ ریختہ کا آغاز دکن میں ہوا"، یہ کہہ کر "چونکہ وہاں کوئی معقول شاعر پیدا نہیں ہوا اس وجہ سے انکے نام سے آغاز نہیں کیا گیا اور میری طبع ناقص یہ بھی گوارہ نہیں کرتی کہ ان میں سے اکثر کے حالات قارئین کے لئے سبب رنج و ملال ہیں"[111] دکن کے شعرا کو نظر انداز کر دیا ہے۔ میر دکنی شاعری اور اس کی طویل روایت سے ناواقف تھے اور یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ روایت جس کے وہ خود ایک ممتاز نمائندہ ہیں، دکنی شاعری کی روایت ہی کا فیض ہے۔

"نکات الشعرا" میں حالاتِ زندگی اور واقعات بہت مختصر ہیں۔ ولادت، وفات اور واقعات کے سنین لکھنے سے میر صاحب کو کوئی رغبت نہیں ہے۔ کئی مقامات پر تو صرف اتنا لکھ دیا ہے کہ ان کا احوال مفصل طور پر فارسی تذکروں میں مسطور ہے۔ مثلاً امیر خسرو کے ذیل میں لکھا ہے کہ "امیر مذکور کے حالات تذکروں میں درج ہیں"[112]۔ یہی بات بیدل، مرزا معز فطرت اور مرزا گرامی کے سلسلے میں لکھی ہے۔ تفصیل سے میر گھبراتے ہیں جیسا کہ خود ٹیک چند بہار کے ذکر میں لکھا ہے کہ "دماغِ تفصیل ندارم"۔[113]

اس تذکرے سے اس دور کی ادبی گروہ بندی کا بھی سراغ ملتا ہے۔ میر صاحب نے ان شعرا کے ذکر میں جانبداری برتی ہے جو ان کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس میں وہ شعرا شامل ہیں جو آرزو سے وابستہ ہیں یا میر سے جن کے ذاتی تعلقات اچھے ہیں یا جو میر کے محسن اور رشتے دار ہیں۔ ان شاعروں کو گرایا ہے جو مرزا مظہر سے تعلق رکھتے ہیں۔ محمد علی حشمت کے بارے میں لکھا ہے کہ "ریختہ کے اشعار نہایت پاچیانہ ہوتے ہیں۔ بہت گپ ہانکتا ہے"[114]۔ محمد یار خاکسار کے بارے میں لکھا ہے کہ "مجھے (جلتے ہوئے) کباب کی لو آتی ہے"[115]۔ احسن اللہ بیان کا ذکر ہی سرے سے نہیں کیا۔ بیان مرزا مظہر کے شاگرد تھے۔ انعام اللہ خان یقین، جو مرزا مظہر کے بڑے شاگرد تھے، ان کو سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق اس طور پر گرایا ہے کہ نکات الشعرا پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف مغرور و متکبر انسان تھے بلکہ شاعر ہی نہیں تھے اور مرزا مظہر

اپنا کلام ان کو دے دیا کرتے تھے۔ میر صاحب کے الفاظ یہ ہیں "کہتے ہیں کہ مرزا مظہر اس کو شعر کہہ کر دیتے ہیں اور اپنے اشعار ریختہ کا وارث گردانتے ہیں۔ اس کی رعونت نے فرعون کی رعونت کو مات کر دیا ہے۔۔۔۔ شعر فہمی کا مذاق بالکل نہیں رکھتا۔"[116] میر صاحب نے ہر اس شاعر کو جو ان کے گروہ سے تعلق نہیں رکھتا تھا یا جس کی استادی اس دور میں مسلم تھی، شعوری طور پر گرانے کی کوشش کی ہے۔ شاہ حاتم کے ذکر میں جو شعرائے دہلی کے سرخیل تھے اور ۱۱۶۵ھ میں جن کی عمر ۸۴ سال تھی، میر صاحب نے "مرد لیست جاہل و متمکن و مقطع و ضع و یہ آشنا، غنانداز د"[117] کے الفاظ استعمال کئے ہیں اور پھر "آشنائے بیگانہ" لکھ کر ان کے اس شعر کی:

ہائے بے درد سے ملا کیوں تھا
آگے آیا مرے کیا میرا

یہ کہہ کر اگر میرا شعر ہوتا تو اس طرح کہتا، یوں اصلاح دی ہے:

مبتلا آتشک میں ہوں اب میں
آگے آیا مرے کیا میرا

اور پھر یہ اصلاح دے کر ان الفاظ میں قہقہہ لگایا ہے کہ "اس مصرع کی گرمی کے آگے اس شعر کی خنکی روشن ہے"۔ نکات الشعرا کے علاوہ سارے تذکرہ نویسوں نے شاہ حاتم کی استادی اور شاعرانہ مرتبہ کو تسلیم کیا ہے۔ خود حاتم نے جیسا کہ ان کے دیوان زادہ[118] سے ظاہر ہے، ۱۱۶۲ھ، ۱۱۶۳ھ اور ۱۱۷۱ھ میں میر کی زمینوں میں غزلیں لکھی ہیں۔ اس تذکرے میں یہی برتاؤ یکرو، قدر، ثاقب، عاجز اور دوسرے شعرا کے ساتھ کیا ہے۔ میری رائے پر ان کی انانیت، خود پرستی، گروہ بندی اور ذاتی تعلقات اور عناد کا گہرا اثر ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ میر صاحب فطرتاً کینہ پرور تھے اور ان کے ہاں معافی کا کوئی خانہ نہیں تھا۔ لیکن ان کے یہ سارے عیوب ان کی شاعرانہ عظمت نے چھپا لئے ہیں۔

اشعار پر اصلاح دینے کا عمل بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ قاضی عبدالودود صاحب کے مطابق میر نے نو شعرا کے ایک سو دس اشعار پر اصلاح دی ہے۔[119] اصلاح

کی ایک نوعیت تو وہ ہے جو انہیں نے حاتم کے محولہ بالا شعر پر دی ہے اور جس میں ذاتی عناد عیاں ہے۔ اصلاح کی دوسری نوعیت وہ ہے جو انہوں نے ابرو، مضمون، ناجی، یکرنگ، یقین، سجاد، خاکسار، ٹیک چند بہار کے اشعار پر دی ہے۔ قرائن بتاتے ہیں کہ نکات الشعرا کے نقش اول میں دوسرے شعرا کے کلام پر اصلاح کا یہ اشتعال انگیز عمل بہت زیادہ تھا۔ ممکن ہے کہ سودا کا کلام بھی زیر اصلاح آیا ہو اور اسی لئے سودا نے ۹ شعر کا ایک ہجویہ قطعہ لکھا جس میں میر کی اصلاح کو "سہو کاتب" قرار دیا۔ اس قطعے کے آخری دو شعر یہ ہیں:

ہے جو کچھ نظم و نثر دنیا میں
زیر ایراد میر صاحب ہے
ہر ورق پر ہے میر کی اصلاح
لوگ کہتے ہیں سہو کاتب ہے

ان اصلاحوں کا ایک مثبت پہلو یہ ہے کہ ان سے پتا چلتا ہے کہ میر زبان و بیان اور محاورے کو برتنے میں احتیاط کے قائل تھے۔ سجاد کے اس شعر کا انتخاب کر کے

میرا جلا ہوا دل مژگان کے کب ہے لائق
اس آبلہ کو کیوں تم کانٹوں میں اینچتے ہو

یہ لکھا کہ "اگرچہ کہاوت میں تصرف جائز نہیں ہے۔ کیوں کہ مثل اس طرح ہے کہ کیوں کانٹوں میں گھسیٹتے ہو۔ لیکن چونکہ شاعر کو سخن پر قدرت ہے میں قابل معافی سمجھتا ہوں"۔ اس رائے میں میر کی نفسی کیفیت توجہ طلب ہے۔ وہ محاورہ میں تصرف کو جائز نہیں سمجھتے لیکن شاعر کو قادر سخن پا کر اور خود کو اس سے بھی بڑا سمجھ کر معاف کر دیتے ہیں۔ یہ ایک احساس برتری ہے جس میں "میں" کی اہمیت ویسی ہی ہے جیسے بادشاہ کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کی ہوتی ہے۔ دوسری اصلاحوں کی نوعیت یہ ہے۔

شعر مضمون:

میرا پیغام وصل اے قاصد
کہو سب سے ادے جدا کر کے

اصلاح میر: میرے پیغام کو تو اے قاصد
کہو سب سے ادا سے جدا کر کے

شعر یکرنگ: اس کو مت بوجھو سجن اوروں کی طرح
مصطفےٰ خان آشنا یکرنگ ہے

اصلاح میر: مت تلوّن اس میں سمجھیں آپ سا
مصطفےٰ خان آشنا یکرنگ ہے

خاکسار کا شعر تھا: خاکسار اس کی تو آنکھوں کے کہے مت لگیو
مجھ کو ان خانہ خرابوں ہی نے بیمار کیا

میر نے لکھا کہ "اس فن کی پیروی کرنے والوں سے پوشیدہ نہیں ہے کہ "بیمار کیا" کی جگہ "گرفتار کیا" ہونا چاہیئے۔"[۱۲۰]

ان اصلاحوں کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ میر صاحب محاورہ کو جس طرح وہ بولا جاتا ہے اسی طرح استعمال کرنے پر زور دیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ شعر میں ابہام کو پسند نہیں کرتے بلکہ چاہتے ہیں کہ شعر اتنا واضح ہو کہ احساس یا جذبہ کا پوری طرح ابلاغ ہو سکے۔ اس کے لئے وہ موزوں الفاظ کے استعمال کو اہمیت دیتے ہیں۔ یقین کے اس شعر پر:

مجنوں کی خوش نصیبی کرتی ہے داغ مجھ کو
کیا عیش کر گیا ہے ظالم دیوانہ پن میں

میر نے یہ اصلاح دی ہے کہ اگر "خوش نصیبی کے بجائے "خوش معاشی" کر دیا جائے تو شعر زیادہ بامزہ ہو جائے۔"[۱۲۱]

لفظوں اور محاوروں کے استعمال میں احتیاط اور اظہار کو مہتر و موثر بنانے کی کوشش یہی اس دور کے تنقیدی معیار تھے۔ کوئی شعر پسند آیا تو اس پر واہ کہہ دیا اور تعریف کر دی اور اگر اس میں کوئی لفظی سقم یا محاورہ و زبان کا غلط استعمال نظر آیا اس پر اعتراض کر دیا۔ تنقید میں رجحانات، میلانات، خیالات اور مزاجِ شاعری کو کوئی اہمیت

حاصل نہیں تھی۔ یہ روایتی معاشرہ تھا اور فرد کے ذہن میں اچھے اور برے کے معیار پورے طور پر واضح تھے۔ "نکات الشعرا" میں نقد و نظر کی یہی نوعیت ہے۔

نکات الشعرا میں مختلف شخصیتوں کے تاثراتی نقوش اکثر گہرے ہیں۔ میر کو چند لفظوں کی مدد سے جیتی جاگتی تصویریں بنانے کا اچھا سلیقہ ہے۔ جب وہ لکھتے ہیں "مظہر تخلص، مرد لیست مقدس مطہر درویش عالم صاحب کمال شہرۂ عالم بے نظیر معزز مکرم" یا امید کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "شاعر غزائے فارسی" "نکتہ پرداز" بذلہ سنج، یار باش، خوش اختلاط، ہمیشہ خندان و شگفتہ رو" یا مضمون کے بارے میں بتاتے ہیں کہ "حریف ظریف ہشاش بشاش ہنگامہ گرم کن مجلسہا، ہر چند کم گو بود لیکن بسیار خوش فکر۔" ناجی کے بارے میں "جوانے بود آبلہ رو، سپاہی پیشہ۔" سودا کے بارے میں "جوانیست خوش خلق و خوش خوئے، گرمجوش، یار باش شگفتہ روئے" درد کے بارے میں "شاعر زود آور ریختہ، در کمال علاقگی دارستہ، خلیق، متواضع آشنائے درست شعر فارسی ہم می گوید۔" تو شخص مذکور کے مزاج اور شخصیت کی انفرادیت ایک دم سامنے آجاتی ہے۔

اس تذکرے کے مطالعے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ میر کا قلم بے باک، تلخ اور زہر میں بجھا ہوا ہے۔ انہیں دوسرے پر وار کرنے میں مزا آتا ہے۔ کوئی ایسا موقع وہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ عشاق کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "ایک شخص ہے کھتری، شعر ریختہ بہت نامربوط کہتا ہے۔" قدر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "اس کی زبان آوارہ لوگوں کی زبان ہے۔" عاجز کے بارے میں کہتے ہیں کہ "اخلاق سے گرا ہوا، ذلیل و بدقوارہ آدمی ہے۔" قدرت اللہ قدرت کے بارے میں کہتے ہیں کہ "اگرچہ تخلص قدرت ہے مگر عاجز سخن ہے۔" یہ میر کا مزاج ہے کہ وہ دوسروں کے بارے میں تلخ سچائی کے اظہار میں عام طور پر خطا نہیں کرتے۔ آبرو یک چشم تھے۔ اس بات کو مزے لے کر اس طرح بیان کیا ہے "دجّال صفت دنیا کی بے توجہی کے باعث اس کی ایک آنکھ بے کار ہو گئی تھی۔" یہاں بظاہر روزگار کو دجّال شمار کیا گیا ہے لیکن دجال کے یک چشم ہونے کی روایت

کیا ہے۔

د۔ ایک انداز فن ریختہ کا وہ ہے جسے خود انہوں نے اختیار کیا ہے اور تمام صنعتوں مثلاً تجنیس، ترصیع، تشبیہ، صفائے گفتگو، فصاحت، بلاغت، ادابندی، خیال وغیرہ پر حاوی ہے۔ میر نے یہ بتایا ہے کہ وہ بھی اس طرز سے محظوظ ہوتے ہیں۔

ان کی تحریر ان کے ذہن کی طرح صاف اور اسلوب موثر ہے۔ انہیں فارسی زبان کے اظہار پر ضرورت کے مطابق قدرت حاصل ہے۔ اس "تذکرے" کے وقت میر کی عمر تیس سال تھی۔

فیضِ میر

محمد تقی میر کی ایک مختصر فارسی تصنیف ہے جسے انہوں نے اپنے بیٹے میر فیض علی کی تعلیم کے لئے لکھا تھا۔ سببِ تصنیف بیان کرتے ہوئے میر نے لکھا ہے کہ

"فقیر حقیر محمد تقی میر تخلص کہتا ہے کہ ان دنوں میرے لڑکے فیض علی کو ترسل (انشاد مکتوب) پڑھنے کا شوق پیدا ہو گیا ہے اس لئے مختصر سی مدت میں، میں نے پانچ بہت ہی مفید حکایتیں لکھی ہیں اور اس تصنیف کا نام اس (لڑکے) کے نام کی رعایت سے "فیضِ میر" رکھا ہے۔"[۱۲۴]

فیض علی میر کے بڑے بیٹے تھے۔[۱۲۵] علی براہیم خان خلیل نے لکھا ہے کہ ۱۱۹۶ھ/۸۲-۱۷۸۱ء میں فرمائش کرنے پر اپنا کلام لکھنو سے بنارس بھیجا تھا۔[۱۲۶] فیض علی سے ہم پہلی بار "ذکرِ میر" میں اس وقت متعارف ہوتے ہیں جب میر اعظم خان پسر اعظم خان کلاں سے ملاقات کے لئے جاتے ہیں۔ اعظم خان اس وقت کھمبیر میں مقیم تھے۔ اور میر کچھ ہی دن پہلے کھمبیر پہنچے تھے۔ ملاقات کے دوران ہمشیرہ سعید الدین خان، خان سامان کی ملازمہ حلوے کا خوان لے کر آئی تو اعظم خان نے میر سے کہا کہ میرا حصہ چھوڑ کر باقی آپ لے جایئے۔ میر نے عذر کیا تو اعظم خان نے کہا "آپ کے بیٹے فیض علی کے کام آئے گا۔"[۱۲۷] صفدر آہ

نے فیض علی کا سنِ پیدائش ۱۱۶۲ھ/۴۹-۱۷۴۸ء متعین کیا ہے اور بتایا ہے کہ "فیضِ میر" کی تصنیف کے وقت ان کی عمر بارہ چودہ سال ہونی چاہیئے لہٰذا اس کتاب کا سال تصنیف ۱۱۷۴ھ یا ۱۱۷۶ھ (۱۷۶۰ یا ۱۷۶۲ء) ہونا چاہیئے۔ اس زمانے میں میر کھمبیر میں تھے۔[۱۲۸]

"فیضِ میر" میں میر نے خدا رسیدہ درویشوں اور مجذوب فقیروں کے محیر العقول واقعات و کرامات حکایات کے انداز میں اس طور پر بیان کئے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ میر ان کے عینی شاہد تھے۔ پہلی حکایت میں ایک درویش شاہ ساہا کے، دوسری حکایت میں ایک وحشی فقیر کے، تیسری حکایت میں شاہ برہان اور شاہ مدن کے، چوتھی حکایت میں اسد دیوانہ کے اور پانچویں حکایت میں میاں سعید مردِ کامل کے حیرت ناک واقعات قلمبند کئے ہیں۔ لکھتے وقت اس بات کا التزام کیا گیا ہے کہ تصوف و درویشی کے بنیادی تصورات پڑھنے والے کے سامنے اس طور پر پیرایۂ بیان میں آئیں کہ ذہن نشین ہو جائیں۔ میر نے اپنی اس تصنیف میں فلسفۂ تصوف اور وحدت الوجود کے چند مسائل کے جواب بھی درویشوں کی زبان سے کہلوائے ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں:[۱۲۹]

۱۔ "اگر تمہارے دل کو اس سراپا ناز سے تعلق ہے تو خود اپنے آپ پر نظر رکھو۔ غور کرو اور اپنی حقیقت کو سمجھو۔ تم خود ہی اپنا مقصود ہو۔" (ص ۲۲، ۲۳)

۲۔ "یہ دنیا ایک دلکش کارواں گاہ ہے۔ یہاں سے حسرت کے سوا کچھ ساتھ نہیں جاتا افسوس ہے اس شخص کی اوقات پر کہ جو جلد آگاہ نہیں ہوتا۔ شیر کی سی زندگی بسر کرو اور آخرت کی فکر کرو۔ وقت جو بھاگا جا رہا ہے اسے ضائع نہ کرو۔" (ص ۲۵، ۲۶)

۳۔ "موت کا مرحلہ جس کو درپیش ہو وہ کیوں نہ روئے۔ سمجھ لو کہ وہ سرمایۂ جان، جو دلوں کا مقصد ہے، اپنے دیدار میں مصروف اور اپنے سراپا میں محو ہے۔ اگر ساتویں آسمان پر پہنچ جاؤ تو بھی بے پرواہ ہے۔ اس کی بے رنگی میں رنگ ہے۔ اس کے سازِ وحدت میں آہنگ ہے۔ وہ پردۂ کثرت میں نوا سازی کرتا ہے۔ شش جہت سے اس کی آواز آتی ہے۔" (ص ۲۶)

۴۔ "محبوب کا عاشق کے ساتھ یہی معاملہ ہے۔ اگر وہ اس کو غیر سے مشغول دیکھتا تو دل سے اتنا نزدیک ہونے پر بھی دوری اختیار کر لیتا ہے۔" (ص ۲۹)

۵۔ "فقیر نے کہا مقدر سے کوئی چارہ نہیں۔ کیا تم نے نہیں سنا کہ ایک فقیر بہت بیمار ہو گیا۔ طبیب نے پرہیز کی سخت تاکید کی۔ اس نے کہا یہ امر تقدیری ہے یا غیر تقدیری۔ اگر غیر تقدیری ہے تو مجھ کو نقصان نہیں پہنچ سکتا اگر تقدیری ہے تو میں بچ نہیں سکتا۔" (ص ۳۲)

۶۔ "لذت کسی خوشگوار چیز کے پانے میں ہے اور الم اس کے خلاف چیز پانے میں۔ قوائے انسانی میں سے ہر قوت اپنی استعداد کے مطابق لذت اور الم کا ادراک کرتی ہے۔ چنانچہ باصرہ کو محبوب کے دیدار میں اور سامعہ کو اچھی آواز سننے میں لذت ملتی ہے شے مدرک جس قدر عظیم ہوتی ہے اسی قدر لذت زیادہ ہوتی ہے۔ پس چونکہ ذات وصفات واجب الوجود سے شریف تر کوئی مدرک نہیں اس لئے اس کی معرفت سے زیادہ خوشگوار کوئی لذت نہیں۔" (ص ۳۶)

۷۔ "روح انسانی بذاتِ خود قدیم ہے اور موت کے معنی روح کا معدوم ہونا نہیں بلکہ قالب سے اس کے تعلق کا قطع ہو جانا ہے بعث وحشر کے معنی یہ نہیں ہیں کہ روح کو وہی قالب ملے گا۔ قالب ایک سواری سے زیادہ نہیں ہے۔ اس کے بدل جانے سے سوار کا کیا نقصان ہے۔" (ص ۳۸)

۸۔ "اگر شوق حدِ کمال پر ہے تو عاشق منزل وصال پر ہے۔ جس قدر شوق میں قصور ہے اسی قدر راہ دور ہے۔ شوقِ کامل مقصودِ دل تک پہنچا دیتا ہے اور عاشق کو معشوق بنا دیتا ہے۔ انسان کا کمال معرفت ہے اور معرفت کا کمال حیرت۔ اگر تو اس کے کمالات میں حیران ہے تو خوش حال ہے اور اگر حقیقتِ حال کے متعلق گفتگو کرتا ہے تو عین وبال ہے۔ سُن دنیا ایک گذرگاہ ہے۔ یہ منزل نہیں ہے، راہ ہے۔ لوگ قافلہ قافلہ چلے جا رہے ہیں۔ زادِ راہ کی فکر کرنی چاہیئے۔" (ص ۳۹)

"فیضِ میر" میں یہ صوفیانہ نکات حکایت بیان کرتے ہوئے بیچ بیچ میں آئے ہیں۔ اسی قسم کی تعلیم، جیسا کہ "ذکرِ میر" سے ظاہر ہوتا ہے، میر کے والد اور چچا نے میر کو دی تھی۔ یہی تعلیم میر اپنے بیٹے تک اپنے انداز میں پہنچانا چاہتے ہیں۔ "فیضِ میر" میں میر کی طرزِ نگارش

نکات الشعرا کے مقابلے میں زیادہ پختہ ہے۔ اس میں جامعیت بھی ہے اور اختصار کے ساتھ بامحاورہ اسلوب میں اپنے مافی الضمیر کو پیش کرنے کا سلیقہ بھی۔ اس میں مسجع ومقفیٰ عبارت کا استعمال عام طور پر اس انداز سے کیا گیا ہے کہ تصنع کا احساس تک نہیں ہوتا بلکہ عبارت کی روانی پڑھنے والے کو اپنے ساتھ بہائے لئے جاتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے چست فقرے، جو عام طور پر مقفیٰ ہیں، طرزِ ادا کے حسن کو بڑھا دیتے ہیں۔ میر کی فارسی نثر کو دیکھ کر میر حسن نے کہا تھا کہ "چراغ نثرش روشن"۔[۱۳۰] اور فیض میر کی نثر دشن چراغ ہے۔

دریائے عشق (نثر فارسی)

دریائے عشق میر کی مشہور اردو مثنوی ہے۔ میر نے اسی قصے کو فارسی نثر میں بھی لکھا ہے۔ مثنوی دریائے عشق اور دریائے عشق (نثر) کے تقابلی مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ میر نے مثنوی لکھنے سے پہلے اسے فارسی نثر میں لکھا اور پھر اسے سامنے رکھ کر سارے واقعات وعبارات کو اردو مثنوی کا روپ دیا۔ مثنوی دریائے عشق کے سارے جزئیات دریائے عشق (نثر) میں موجود ہیں۔ رضا لائبریری رامپور کے مخطوطے (کلیاتِ میر) میں میر کے چھ دواوین اور سارے کلام کے علاوہ دیوانِ فارسی، ذکرِ میر اور فیضِ میر بھی شامل ہیں۔ "دریائے عشق" (نثر) مثنوی دریائے عشق سے پہلے بطور تمہید شامل کی گئی ہے۔ امتیاز علی خان عرشی نے میر کی اس نثر فارسی کا پورا متن شائع کر دیا ہے۔[۱۳۱]

ذکرِ میر

ایک اہم تصنیف ہے جس سے مطالعۂ میر کے بہت سے نئے گوشے سامنے آتے ہیں۔ یہ اپنے انداز میں میر کی خود نوشت سوانح عمری ہے جسے میر نے "نکات الشعرا" اور "فیضِ میر" کی طرح فارسی میں لکھا ہے۔ اس دور میں اردو نے تیزی کے ساتھ فارسی کی جگہ ضرور لے لی تھی مگر مراسلت اور علمی وادبی تحریروں میں اب بھی فارسی ذریعۂ اظہار تھی۔ اس زمانے میں فارسی میں گفتگو کرنا یا تحریری طور پر اظہارِ خیال کرنا معاشرے میں اسی طرح عزت واحترام کی بات تھی جس طرح آج انگریزی میں گفتگو کرنا یا اس میں لکھنا تعلیم یافتہ ہونے کی علامت ہے، حالانکہ نہ وہ فارسی ایسی تھی جو کسی لحاظ سے قابلِ ذکر ہو اور نہ یہ انگریزی ایسی ہے جسے کسی طرح بھی معیاری کہا جا سکے۔ "ذکرِ میر" میں جہاں میر نے اپنے

خاندانی اور ذاتی حالات کو بیان کیا ہے وہاں اپنے دور کے ان حالات و کوائف اور تاریخی واقعات پر بھی روشنی ڈالی ہے جن کے میر عینی شاہد تھے۔ نادر شاہ کے حملے (۱۱۵۱ھ/۱۷۳۹ء) کے بعد سے غلام قادر روہیلہ کے ظلم و جبر اور مرہٹوں کے ہاتھوں اس کے مارے جانے (۱۲۰۳ھ/۱۷۸۸ء) تک کے واقعات، جو پچاس سال کا احاطہ کرتے ہیں، "ذکرِ میر" میں ملتے ہیں۔ اس اعتبار سے ذکرِ میر ایک تاریخی ماخذ کا درجہ بھی رکھتی ہے۔

"ذکرِ میر" کے اب تک کئی مخطوطے دریافت ہو چکے ہیں۔ ایک "نسخۂ اٹاوہ" ہے جو مولوی لبشیر الدین مرحوم کی ملکیت تھا اور جس کی اردو تلخیص مولوی عبدالحق نے رسالہ "اردو" اورنگ آباد میں ۱۹۲۶ء میں شائع کی تھی۔ بعد میں ذکرِ میر کے فارسی متن کو مرتب کر کے ۱۹۲۸ء میں کتابی شکل میں انجمن ترقی اردو سے شائع کیا۔ نسخۂ اٹاوہ ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء کا مکتوبہ ہے۔ اس وقت میر (۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء) زندہ تھے۔ اس میں سالِ تصنیف کا قطعہ تاریخ یہ ہے:

مسمّی بہ اسمے شد لے باہنر
کہ ایں نسخہ گردد بعالم ثمر
ز تاریخ آگہ شوی بے گماں
فزائی عدد بست و ہفت اربراں

"ذکرِ میر" سے ۱۱۷۰ھ/۵۷-۱۷۵۶ء برآمد ہوتے ہیں۔ اس میں بست و ہفت یعنی ۲۷ جوڑنے سے سال تصنیف ۱۱۹۷ھ/۸۳-۱۷۸۲ء نکلتا ہے۔ اس نسخے کے خاتمے کی عبارت میں میر نے اپنی عمر ۶۰ سال بتائی ہے ..... ع "عمر عزیز بشصت سالگی کشید"[۱۳۳] لیکن اس نسخے میں ۱۱۹۷ھ کے بعد کے واقعات بھی شامل ہیں۔ آخری واقعہ مرہٹوں کے ہاتھوں غلام قادر روہیلہ کا قتل ہے جو ۱۲۰۳/۱۷۸۸ء کا واقعہ ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ۱۱۹۷ھ/۸۳-۱۷۸۲ء کے بعد بھی میر نے واقعات کا اضافہ کیا ہے لیکن نسخۂ لاہور، جو پروفیسر محمد شفیع کی ملکیت تھا، ۲۶ ربیع الاوّل ۱۲۳۱ھ/۲۶ فروری ۱۸۱۶ء کا لکھا ہوا ہے۔ قطعہ تاریخِ تصنیف کے پہلے تین مصرعے وہی ہیں جو اوپر نقل ہوئے لیکن چوتھا مصرع

اس طرح ہے ..... ع "فزائی دہ و شش عدد ار براں"[۱۳۴] اس قطعے کے مطابق ذکرِ میر ۱۱۷۰+ ۱۶ = ۱۱۸۶ھ میں مکمل ہوئی۔ خاتمے کی عبارت میں میر نے اپنی عمر "پنجاہ" سال بتائی ہے[۱۳۵]۔ نسخۂ لاہور کے آخر میں چھ لطائف بھی درج ہیں۔ اس نسخے کی عبارت مطبوعۂ "ذکرِ میر" کے صفحہ ۱۲۸ کی سطر ۴ کے مطابق ختم ہو جاتی ہے اور اس کے بعد یہ عبارت آتی ہے ..... "آنچہ از اسلوب معلوم می شود حسام الدین خان دراصل از میاں رفت چراکہ بدستِ دشمنانِ جانی افتادہ است تا مقدور زندہ نخواہید گذاشت وگرنہ اختیار در دست اوست ....."

نسخۂ رامپور بھی نسخۂ لاہور کی طرح ہے۔ اس میں بھی وہی عبارت ہے جس میں میر نے اپنی عمر پچاس سال بتائی ہے۔ ذکرِ میر کا یہ نسخۂ رامپور کلیاتِ میر کا حصہ ہے جسے کاتب شفیع لطیف علی حیدری نے مرزا قنبر علی کے لئے ۲۹ رمضان ۱۲۴۶ھ/۱۴ مارچ ۱۸۳۱ء کو مکمل کیا۔ نسخۂ رامپور بھی نسخۂ لاہور کی طرح مطبوعہ ذکرِ میر صفحہ ۱۲۸ سطر ۴ کے مطابق ختم ہوتا ہے۔ قطعہ سالِ تصنیف نسخۂ رامپور میں شامل نہیں ہے۔

ذکرِ میر کا ایک نسخہ پروفیسر مسعود حسین رضوی ادیب کی ملکیت تھا جس کا ذکر انہوں نے مقدمۂ "فیضِ میر"[۱۳۵] میں کیا ہے۔ ذکرِ میر کا ایک نسخہ شاہانِ اودھ کے کتب خانے میں بھی تھا جس کا تعارف اشپرنگر نے اپنی وضاحتی فہرست میں کرایا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ ایشیاٹک سوسائٹی میں بھی کلیاتِ میر کا ایک خوبصورت نسخہ ہے جس میں فارسی نثر کی چند تصانیف بھی شامل ہیں[۱۳۶]۔ ایک نسخہ گوالیار میں بھی ہے[۱۳۷]۔

جیسا کہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں میر معرکۂ سکرتال میں راجہ ناگرمل کے بیٹے رائے بہادر سنگھ کے ساتھ شاہی لشکر میں موجود تھے۔ معرکۂ سکرتال ۱۹ ذیقعدہ ۱۱۸۵ھ/۲۳ فروری ۱۷۷۲ء کو ہوا اور ضابطہ خان بھاگ گیا۔ اس کے بعد میر دلی آکر خانہ نشین ہو گئے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب انہوں نے "ذکرِ میر" لکھنی شروع کی۔ ذیقعدہ گیارہواں مہینہ ہے اس لئے "ذکرِ میر" ۱۱۸۶ھ/۷۳-۱۷۷۲ء میں لکھی گئی۔ اس کی تصدیق جہاں نسخۂ لاہور کے قطعہ سالِ تصنیف سے ہوتی ہے وہاں میر نے "ذکرِ میر" کے "سببِ تالیف" میں خود بھی بیان کر دیا ہے۔

"فقیر میر محمد تقی میر تخلص کہتا ہے کہ میں ان دنوں بیکار اور گوشۂ تنہائی میں بے یار و مددگار تھا۔ میں نے اپنے حالات، سوانح روزگار، حکایات اور روایات شامل کر کے لکھے اور اس نسخے کو، جو ذکر میر سے موسوم ہے لطائف پر ختم کیا۔" ۱۳۸

اس وقت میر کی عمر، جیسا کہ انہوں نے خود بتایا ہے، پچاس سال تھی۔ اس کے بعد وہ 'ذکر میر' میں اضافے کرتے رہے اور ۱۱۹۶ھ/ ۱۷۸۲ء میں لکھنؤ پہنچ کر، لکھنؤ کے حالات و واقعات کا اضافہ کر کے اور قطعہ سال تصنیف میں ۱۶ کے بجائے ۲۷ کا عدد شامل کر کے سال تصنیف ۱۱۹۷ھ/ ۸۳-۱۷۸۲ء کر دیا۔ آخری حصے میں غلام قادر روہیلہ کے ظلم و جبر اور پھر اس کے قتل کئے جانے کا حال بھی لکھا۔ غلام قادر روہیلہ کا قتل ۱۲۰۳ھ/ ۱۷۸۸ء کا واقعہ ہے اس لئے یہ اضافہ اسی سال ہوا ہوگا۔ اس وقت میر کی عمر ۶۸ سال تھی لیکن عبارت کے لفظ "شصت" (۶۰) میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ قاضی عبدالودود صاحب کا خیال ہے کہ "آغاز کتاب کے زمانے کے بارے میں میرا قیاس ہے ۱۱۸۵ھ/ ۷۲-۱۷۷۱ء تو کتاب کا بیشتر حصہ (نسخۂ مطبوعہ میں ص ۱ سے ۱۲۰ تک کا مان میں قلمبند ہوا) محض چند صفحے (ص ۱۲۱ تا ص ۱۲۸ سطر ۴) دہلی میں اور باقی لکھنؤ میں معرض تحریر میں آیا۔ لکھنؤ کے سفر اور وہاں پہنچنے کے بعد کے واقعات کے بارے میں تو اختلاف رائے کی گنجائش ہی نہیں ..... خاتمہ دہلی میں تحریر ہوا ہے۔ (ص ۱۵۱ تا ۱۵۳)۔ لطائف چونکہ نسخۂ لاہور میں موجود ہیں اور آخر کتاب میں ہیں، قیاس چاہتا ہے کہ دہلی میں حوالۂ قلم ہوئے ہیں۔" ۱۳۹ ذکر میر کا بڑا حصہ کا مان میں لکھے جانے کا کوئی معقول ثبوت نہیں ہے۔ نسخۂ رامپور کی عبارت کے اس جملے سے کہ "احوال فقیر تین سال سے چونکہ کوئی قدردان موجود نہیں ہے اور عرصۂ روزگار بہت تنگ ہے" ۱۴۰ یہی بات سامنے آتی ہے کہ 'ذکر میر' دہلی میں لکھی گئی۔ راجہ ناگرمل کے ساتھ وہ کا مان سے ۱۱۸۵ھ/ ۷۲-۱۷۷۱ء میں دہلی ضرور آئے تھے لیکن دہلی آتے ہی ان سے الگ ہو گئے تھے اور پھر راجہ ناگرمل کے بڑے بیٹے کے ساتھ شاہی لشکر میں معرکۂ سکرتال میں موجود تھے اور وہاں سے دہلی واپس آ کر خانہ نشین ہو گئے تھے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب انھیں حالات و سوانح روزگار لکھنے کا خیال آیا

اور چونکہ معرکۂ سکرتال ۱۹ ذیقعدہ ۱۱۸۵ھ/ ۲۳ فروری ۱۷۷۲ء ہجری سال کے گیارہویں مہینے کا واقعہ ہے اس لئے ذکر میر ۱۱۸۶ھ/ ۷۳-۱۷۷۲ء میں لکھی گئی اور اسی سال میں مکمل ہوئی۔

"ذکر میر" لکھنے کی ایک وجہ تو وہی ہے جو میر نے خود لکھی ہے کہ ان دنوں وہ بیکار تھے اس لئے اپنے حالات اور سوانح روزگار لکھنے کا ارادہ کیا لیکن ذکر میر کے مطالعے سے اس کی ایک وجہ تصنیف یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ وہ اپنے سوتیلے بڑے بھائی حافظ محمد حسن اور اپنے مشفق و محسن، سوتیلے ماموں سراج الدین علی خان آرزو سے، جنہوں نے ان کی تعلیم و تربیت کی تھی اور کم و بیش سات سال اپنے گھر رکھا تھا، اظہار نفرت کر کے اپنے سارے رشتے ناتے کاٹ ڈالیں تاکہ ایک طرف ان کے احسانات پر پانی پھر جائے اور دوسری طرف وہ اپنی ناراضی، ذاتی پرخاش کا تحریری انتقام لے سکیں۔ یہ کام وہ پہلے بھی کر سکتے تھے اس لئے کہ وہ تقریباً ۱۱۶۰ھ/ ۴۷-۱۷۴۷ء میں آرزو سے الگ ہو گئے تھے لیکن اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت آرزو زندہ تھے اور ایک بااثر شخص تھے۔ اگر یہ باتیں ان کے علم میں آتیں تو وہ میر کے جھوٹ کا جواب دے کر اصلیت سے پردہ اٹھاتے۔ جب ۱۱۶۹ھ/ ۵۶-۱۷۵۶ء میں آرزو کا انتقال ہو گیا تو ۱۱۷۰ھ/ ۵۷-۱۷۵۶ء میں، جیسا کہ ذکر میر کے تاریخی نام سے ظاہر ہوتا ہے، انہوں نے اپنے سوانح لکھنے کا ارادہ کیا۔ ۱۱۸۵ھ تک حالات زمانہ نے انہیں فرصت نہ دی اور جب ۱۱۸۵ھ/ ۱۷۷۲ء کے آخر میں وہ خانہ نشین ہوئے تو آرزو کی وفات کے سولہ سال بعد یہ کام شروع کیا۔ اس وقت ان کا جواب دینے والا کوئی نہیں تھا۔ دوسرا مقصد اس تالیف کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے والد کو ایک یگانۂ روزگار درویش کے روپ میں پیش کریں۔ ان کے والد علی متقی اور ان کے کشف و کرامات کا بیان ۶۱ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ "ذکر میر" پڑھنے ہوئے سوتیلے بھائی اور ماموں سے شدید نفرت اور باپ سے انتہائی محبت کے اظہار میں مبالغے کا شدید احساس ہوتا ہے۔ میر نے اپنی زندگی کے سارے حالات ذکر میر میں بیان نہیں کئے ہیں۔ ذاتی حالات کے بیان میں سارا زور محبت اور نفرت کے اظہار پر صرف کر دیا ہے۔ اس کے بعد اس دور کے حالات و واقعات ہیں جن کے میر عینی شاہد ہیں اور

جن کی لہروں پر ہچکولے کھاتے ہوئے محمد تقی میر نے زندگی کا سفر طے کیا۔ بیچ بیچ میں ضمناً ذاتی حالات کی طرف بھی اشارے ملتے ہیں۔ جیسے نکات الشعرا کے مطالعے سے میر ایک گروہ بند اور ادبی سیاست باز کے روپ میں سامنے آتے ہیں جنہیں دوسروں کی پگڑی اچھالنے، حریفوں کو ذلیل کرنے میں مزا آتا ہے اور جو اپنے آگے کسی کو کچھ نہیں سمجھتے، اسی طرح 'ذکرِ میر' میں وہ ایک کینہ پرور، بدلہ لینے والے، اپنوں کو آسمان پر چڑھانے اور دشمنوں کو پاتال میں پہنچا دینے والے کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ خود پسندی اور ذات پرستی کی وجہ سے میر کی سیرت میں معافی کا خانہ نہیں تھا۔ اسی اندازِ نظر کی وجہ سے وہ واقعات کو مسخ کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے مثلاً میر نے احسان اللہ فقیر سے اپنے چچا امان اللہ کی ملاقات کا واقعہ لکھا ہے[11]۔ میر لکھتے ہیں کہ وہ بھی چچا کے ساتھ تھے اور دورانِ ملاقات صوبیدار اکبر آباد نصرت یار خان قدم بوسی کے لئے حاضر ہوا تھا۔ میر نے اس وقت اپنی عمر سات سال بتائی ہے۔ "تاریخ محمدی" سے معلوم ہوتا ہے کہ نصرت یار خان کا انتقال ۲۲ رمضان ۱۱۳۴ھ/۲۶ جون ۱۷۲۲ء کو ہوا جب کہ میر کی پیدائش اگلے سال ۱۱۳۵ھ/۲۳-۱۷۲۲ء میں ہوئی۔ اب یہ کیسے ممکن ہے کہ میر صاحب پیدائش سے پہلے وہاں پہنچ گئے ہوں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ واقعہ انہوں نے امان اللہ سے سنا ہوگا۔ ذکرِ میر لکھتے وقت اپنے چچا کا درجہ بلند کرنے کے لئے اس واقعہ کو اس طرح درج کیا کہ وہ بظاہر درست معلوم ہو۔ ویسے بھی سات سال کی عمر کے بچے کو وہ ساری ہدایات و نصائح، جو فقیر احسان اللہ کی زبان سے میر نے کہلوائے ہیں اتنی تفصیلی جزئیات کے ساتھ کیسے یاد رہ سکتی ہیں؟

ذکرِ میر کے مطالعے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ سنین سے میر صاحب کو کوئی دلچسپی نہیں ہے حتیٰ کہ اپنے والد کی تاریخِ وفات "بست و یکم رجب"[12] (۲۱ رجب) لکھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے کئی مقامات پر تاریخی واقعات گڈمڈ ہو گئے ہیں مثلاً احمد شاہ ابدالی کے دو حملوں کے واقعات ایک دوسرے سے خلط ملط ہو گئے ہیں۔

'ذکرِ میر' کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ رعایت خان، نواب بہادر جاوید خان، مہانارائن، راجہ جگل کشور، راجہ ناگرمل، رائے بہادر سنگھ، رائے لشن سنگھ کے ملازم و متوسل رہے اور آخر میں نواب آصف الدولہ کی سرکار سے وابستہ ہو گئے۔ ذکرِ میر سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ تصوف کی طرف میر کا رجحان، اپنے والد اور چچا کے زیرِ اثر، بچپن سے تھا۔ میر نے تصوف و معرفت کے جو خیالات اپنے اشعار میں پیش کئے ہیں ذکرِ میر میں انہیں کی وضاحت کی ہے۔ "نکات الشعرا" کی طرح ذکرِ میر کے مطالعے سے بھی آبِ حیات، کی وہ تصویر، جو محمد حسین آزاد نے بنائی ہے، فضا میں تحلیل ہو جاتی ہے۔

ذکرِ میر کا اندازِ بیان شگفتہ، رواں اور پختہ ہے۔ میر کو فارسی نثر پر اچھی قدرت حاصل ہے۔ یہ نثر فارسی کے ہندوی اسلوب کی ایک نمائندہ مثال ہے۔

اس کتاب کے حوالے سے میر کی زندگی کا مطالعہ چونکہ ہم پچھلے صفحات میں کر چکے ہیں اس لئے ان کا یہاں دہرانا غیر ضروری ہے البتہ ذکرِ میر کے آخر میں جو لطائف[13] میر نے دیئے ہیں اور جنہیں ذکرِ میر کے فاضل مرتب نے غیر ضروری و فحش کہہ کر خارج کر دیا ہے، ان میں سے چند یہاں درج کرتے ہیں کہ آزاد کے منہ لبسورتے ہوئے میر کے بجائے ایک زندہ، جیتے جاگتے میر سے بھی آپ کا تعارف ہو سکے:

۱۔ مولانا روم اور شیخ صدر الدین شام کے وقت شام کی مسجد میں وارد ہوئے اور وہاں امام کے پیچھے نماز پڑھی۔ امام پر ان دونوں بزرگوں کی اتنی ہیبت طاری ہوئی کہ دونوں رکعتیں سورۂ فاتحہ کے ساتھ سورہ قل یا ایہا الکافرون پر ختم کیں۔ جب سلام پھیرا تو شیخ نے مولانا کی طرف دیکھا اور پوچھا کہ ایک سورت کو دو بار پڑھنے کا کیا مطلب تھا؟ مولانا ہنسے اور کہا کہ بات معقول ہے۔ ایک کا خطاب تمہاری طرف تھا اور ایک کا میری طرف۔"

۲۔ "ایک دن انوری ایک دکان پر بیٹھا تھا........ اس مُردے کے ورثا نوحہ و زاری کرتے ہوئے جا رہے تھے اور کہتے جا رہے تھے کہ تجھے ایسی جگہ لئے جاتے ہیں کہ تنگ و تاریک ہے۔ چراغ بھی نہیں ہے۔ انوری دوڑ کر گیا اور پوچھا کہ کیا "میرے گھر لے جا رہے ہیں؟

یہ لطیفہ بادشاہ وقت تک پہنچا تو اس نے اُسے ایک وسیع مکان عنایت کر دیا۔"

۳۔ "ایک لوطی گدھی کے ساتھ مجامعت کر رہا تھا۔ ایک شخص کی نظر پڑی اور پوچھا کہ یہ کیا حرکت ہے؟ اس نے کہا "تجھے کیا خبر کہ مردانِ خدا کس کام میں ہیں۔"

۴۔ "ایک مفلس سیّد اپنا وطن چھوڑ کر تلاشِ معاش میں دہلی آیا اور فاقہ کرتے کرتے کمزور و نحیف ہو گیا۔ اس نے اپنے وطن میں سورہ قل یا ایہا الکافرون بڑی سی تختی پر بخطِ جلی لکھا دیکھا تھا اتفاقاً اُس کا گزر ایک مکتب کی طرف سے ہوا اور وہاں اسی سورت کو باریک خط میں لکھا دیکھا تو کہنے لگا "سبحان اللہ۔ گردشِ ایام نے بیچاری سورتِ قُل کو بھی اس کے اصلی حال پر نہ رہنے دیا۔ اس قدر لاغر کر دیا کہ شناخت میں بھی نہیں آتی۔"

۵۔ "ایک سیّد ایک لڑکے کو لایا۔ پوچھا کہ کیا نام ہے۔ جواب ملا "ابوجہل" سیّد سے پوچھا کہ آپ کا بارہ کتنی مدت سے آباد ہے۔ جواب دیا کہ پانچ ہزار سال ہوئے ہوں گے۔ کہا گیا کہ سیادت تو پیغمبر علیہ السلام کے زمانے سے شروع ہوتی ہے اور اس برگزیدہ آفاق کے عہد کا تعین سب کو معلوم ہے۔ جواب دیا "وہ دوسرے سیّد ہیں اور ہم دوسرے سیّد ہیں۔"

۶۔ "الف ابدال ایک شاعر تھا اور الف تخلص کرتا تھا۔ مدایا میں رہتا تھا۔ شاہ عباس سے عمائدین نے کہا کہ یہ شخص مالدار ہے۔ اس سے کچھ وصول کرنا چاہیئے۔ شاہ نے حضور میں طلب کیا اور کہا "میں نے سُنا ہے کہ تمہارے پاس مال و دولت بہت ہے۔" اس نے جواب دیا "آپ کے قربان جاؤں آپ نے یہ تو سُن لیا کہ میرے پاس دولت ہے مگر یہ نہیں سنا کہ الف خالی ہوتا ہے۔" بادشاہ ہنسا اور محجوب ہو گیا۔"

۷۔ "ایک روز محمد حسین کلیم، جو مرزا بیدل کے طرز پر شعر کہتا تھا، اسد یار خان بخشی نواب بہادر کے پاس، جو شوخ طبع تھا، گیا اور اپنے بہت سے تازہ اشعار پڑھے۔ وہ پریشان ہو گیا اور مجھ

سے مخاطب ہو کر کہا کہ رات ایک عجیب خواب دیکھا ہے۔ میں نے کہا "اس کی تفصیل بتایئے۔" کہنے لگے کہ میں نے دیکھا کہ حضرت علی کی خدمت میں حاضر ہوں اور ایک فقیر دروازے پر شور کر رہا ہے۔ میری طرف اشارہ کیا۔ یعنی دونوں بیٹھ جائیں ..... (لیکن فقیر) لنگوٹ بند بھاری ڈنڈا کندھے پر رکھے ہوئے کھڑا رہتا ہے۔ میں نے کہا کہ اے بہادر اس تن و توش کے ساتھ تجھے کس نے مارا ہے کہ برابر روئے جا رہا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ میں بیدل ہوں۔ کلیم نام کا ایک ریختہ گو ہر روز میرے دیوان سے دو سو مضامین پرچ عبارت میں اپنے نام سے پڑھتا ہے۔ یہ بات میرے لئے سوہانِ روح ہے۔ خدا کے واسطے اس بے درد سے کہیے کہ میرے دیوان سے دست بردار ہو جائے۔ میں نے جواب دیا کہ جا میں اس کو سمجھا دوں گا۔ کلیم بے چارہ شرمندہ ہوا اور چلا گیا۔" ف

۸۔ "ملا فرج اللہ خوشتر دہلی آیا۔ یہاں میاں ناصر علی کے اشعار کا غلغلہ سُن کر ملاقات کا مشتاق ہوا۔ ایک دن اس کی ملاقات کے لئے گیا۔ ناصر علی نے پوچھا کہ آپ کا نام کیا ہے کہا "فرج اللہ" ناصر علی مسکرائے اور کچھ سوچنے لگے۔ جب ملا نے دیکھا کہ وہ بالکل خاموش ہیں تو دانستہ طور پر کہا کہ اگر آپ اپنا اسم شریف بھی مجھے بتا دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ انہوں نے سر جھکایا اور کہا "ذکر اللہ" ملا بہت بے مزہ ہوا اور کہا "لعنت اللہ"۔"

۹۔ "ایک روز ناصر علی کی مرزا بیدل کے ایک شاگرد سے ملاقات ہوئی۔ پوچھا کہ آجکل مرزا کیا کر رہے ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ ان دنوں "چہار عنصر" لکھ رہے ہیں۔ یہ سُن کر ناصر علی نے کہا کہ میرا یہ پیام پہنچا نا کہ اپنا قیمتی وقت کیوں ضائع کر رہے ہو۔ کل یہ چہار عنصر ختم ہو جائیں گے۔ اپنی پنج روزہ عمر کو ضائع نہ کریں۔

یہ لطیفے میر نے "برائے خاطر دوستان" لکھے ہیں۔ ان سے میر کی شخصیت کا وہ

ف۔ یہی لطیفہ بہادر علی چھپرا موئی کی کتاب "قصر اللطائف" کے حوالے سے خیراتی لال بے جگر نے "تذکرۂ بے جگر" میں بھی درج کیا ہے۔ مفہوم یہی ہے البتہ عبارت میں فرق ہے (تذکرۂ بے جگر مخطوط انڈیا آفس لائبریری ص ۳۰)

پہلو بھی سامنے آتا ہے جواب تک چھپا ہوا تھا۔ ذکرِ میر، میر کی زندگی، سیرت اور مزاج سے روشناس ہونے کے لئے ایک اہم ماخذ کا درجہ رکھتا ہے۔

دیوانِ فارسی

میر کا دیوانِ فارسی اب تک شائع نہیں ہوا۔ اس کے کئی مخطوطے اب تک دریافت ہو چکے ہیں۔ ایک قلمی نسخہ مسعود حسین رضوی ادیب کے کتب خانے میں ہے[۱۴۴] ایک مخطوطہ کلیاتِ میر کے ساتھ رضا لائبریری رامپور میں ہے[۱۴۵] ایک بیاض مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ذخیرۂ سبحان اللہ میں محفوظ ہے[۱۴۶] ایک نسخہ شاہ عنمگین کے کتب خانہ میں گوالیار میں مخزون ہے[۱۴۷]

میر کی شاعری کا آغاز ریختہ گوئی سے ہوا اور فارسی میں شعر کہنے کا خیال انہیں بہت بعد میں آیا۔ اسی لئے مجمع النفائس (۱۱۶۴ھ/ ۵۱-۱۷۵۰ء) میں میر کا ذکر نہیں ہے لیکن مجمع النفائس نسخۂ رامپور کے حاشیے پر، جسے میر کے مُربّی راجہ ناگر مل کے لئے جیپت رائے کھتری نے کوٹھیر میں ۱۱۷۸ھ/ ۶۵-۱۷۶۴ء میں نقل کیا تھا، میر کا ذکر کسی اور کے قلم سے لکھا ہوا ملتا ہے۔ عرشی صاحب کا خیال ہے کہ "میر کا حال وغیرہ پہلے کاتب نے نہیں لکھا تھا۔ مصحح نے نئے ورق داخل کر کے، وہ مصرع جو سابق الذکر شاعر کا آئندہ صفحہ پر تھا اور اس کی ترک چھیل کر میر کے حال کے شروع میں لکھ دی ہے اور اس طرح آخری صفحے پر جگہ نہ رہنے کے باعث کچھ میر کے اشعار حاشیے پر بھی لکھے ہیں[۱۴۸]" نکات الشعرا (۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء) میں میر نے اپنی فارسی شاعری کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے، خود اس عبارت سے، جو مجمع النفائس کے محولہ بالا نسخے میں لکھی گئی ہے، اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ میر نے فارسی شاعری کی طرف ریختہ گوئی کے بہت بعد توجہ دی۔ وہ عبارت یہ ہے:

"اول اول اشعار ریختہ کی، کہ اردو زبان میں فارسی طرز کے شعر کو کہتے ہیں، بہت مشق کی چنانچہ شہرۂ آفاق ہے۔ اس کے بعد بطرز خاص اشعارِ فارسی کی طرف رجوع ہوئے جو اربابِ سخن اور فن کے جاننے والوں

کو بہت پسند آئے"[۱۴۹]

فارسی انشا کا یہ انداز میر کے اندازِ انشا سے ملتا ہے۔ اس عبارت میں "اشعارِ ریختہ کہ بزبان اردو مشعریست بطرز فارسی" کا ٹکڑا کم و بیش وہی ہے جو نکات الشعرا میں میر نے لکھا ہے۔ ممکن ہے مجمع النفائس میں یہ عبارت خود میر کے ایما سے بڑھائی گئی ہو لیکن یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا، البتہ یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ میر نے فارسی گوئی ریختہ گوئی کے بعد شروع کی جس کی تصدیق مصحفی کے تذکرے سے بھی ہوتی ہے:

"اور چونکہ ابتدائے شاعری میں ریختہ گوئی کی بنا پر شہرت حاصل کر لی تھی (لیکن) فارسی گوئی کے دعویدار نہ تھے حالانکہ فارسی ریختہ سے کم نہیں کہتے۔ بیان کرتے تھے کہ میں نے دو سال ریختہ گوئی موقوف کر دی تھی۔ اس مدت میں تقریباً دو ہزار اشعار کا فارسی دیوان تیار ہو گیا"[۱۵۱]

مصحفی کا تذکرہ "عقدِ ثریا" ۱۱۹۹ھ/ ۸۵-۱۷۸۴ء میں مکمل ہوا۔ اس وقت میر کو لکھنؤ آئے ہوئے تقریباً تین سال کا عرصہ ہو چکا تھا "می گفت" کے الفاظ یہ بتا رہے ہیں کہ یہ بات میر نے مصحفی سے کہی تھی۔ مصحفی اس وقت لکھنؤ میں تھے[۱۵۲] اور میر سے ان کے مراسم بھی تھے[۱۵۳] یہ دو سال جو میر نے فارسی گوئی میں صرف کئے یقیناً ۱۱۹۹ھ سے پہلے کی بات ہے۔ ۱۱۷۸ھ/ ۶۵-۱۷۶۴ء میں "مجمع النفائس" کے محولہ بالا نسخے (مخزونہ رامپور) میں میر کا ذکر بحیثیت فارسی گو شامل کیا گیا ہے۔ اس لئے قیاس کیا چاہیئے کہ نکات الشعرا ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء کے بعد اور ۱۱۷۸ھ/ ۶۵-۱۷۶۴ء سے پہلے میر نے فارسی میں شاعری کی اور وہ دو سال ۱۱۶۵ و ۱۱۷۸ھ (۱۷۵۲ و ۱۷۶۵ء) کے درمیان آئے ہوں گے۔

میر کے فارسی کلام پر ان کے اپنے مزاج کی گہری چھاپ ہے۔ وہ اردو شاعری کی طرح فارسی میں بھی کسی کی پیروی نہیں کرتے۔ ان کی فارسی شاعری کا رنگ اردو شاعری جیسا ہے بلکہ اکثر اشعار اردو اشعار کا چربہ یا ترجمہ معلوم ہوتے ہیں مثلاً یہ چند اشعار دیکھئے[۱۵۴]

میر کے فارسی اشعار

ندیدم میر را در کوئے او لیک
غبارے ناتوانے با صبا بود

گل و آئینہ و مہ و خورشید
ہر کسے را بسوئے تو دارد

غلط کردم کہ رفتم ..... از خود
ندانستم درین قالب خدا بود

دوش بر شعر ترے در رقص آمد جانِ ما
چوں نظر کردیم بود آں شعر در دیوانِ ما

بر سرِ ما بدم نزع رسیدی بعبث
ما کجا ایم؟ تو تصدیع کشیدی بعبث

میر جائے کہ بہ نیرانِ محبت می سوخت
صبح دیدم بجا ماندہ کفِ خاک آنجا

دل می کشد بہ صحرا ہنگام کار آمد
شور لیست در سرِ من شاید بہار آمد

وے در سینۂ من قطرہ خونے بود است
چوں بچشم آمد از شیوۂ طوفاں دیدم

ہر چند گفتہ اند کہ اے میر روزِ حشر
دیدارِ عام می شود اما نمی شود

منعم اے خانہ خراب ایں ہمہ شوقِ تعمیر
سالہا ساختۂ جاہ و مکاں آخر ہیچ

میر کے اردو اشعار

نہ دیکھا میرِ آوارہ کو لیکن
غبار اک ناتواں سا کو بکو تھا

گل و آئینہ کیا خورشید و مہ تھا
جدھر دیکھا تدھر تیرا ہی رُو تھا

غلط تھا آپ سے غافل گزرنا
نہ سمجھا میں کہ اس قالب میں تو تھا

جس شعر پر سماع تھا کل خانقاہ میں
وہ آج میں سُنا تو ہے میرا کہا ہوا

آیا تو سہی وہ کوئی دم کے لئے لیکن
ہونٹوں پہ مرے جب نفسِ بازپسیں تھا

آہوں کے شعلے جس جا اٹھے ہیں میر شبکو
واں جا کے صبح دیکھا مشتِ غبار پایا

اک موج ہوا پیچاں اے میر نظر آئی
شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

جگر ہی میں یک قطرہ خوں ہے سرشک
پلک تک گیا تو تلاطم کیا

موقوف حشر پر ہے سو آتے بھی وے نہیں
کب درمیاں سے وعدۂ دیدار جائے گا

منعم نے بنا ظلم کی رکھ گھر تو بنایا
پر آپ کوئی رات ہی مہمان رہے گا

ان اشعار سے میر کے فارسی و اردو کلام کی گہری مماثلت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ میر کے فارسی کلام میں وہی موضوعات ہیں جو اردو شاعری میں ملتے ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ میر کا اردو کلام پڑھ کر جب فارسی کلام پڑھتے ہیں تو اس میں وہ گھلاوٹ، سوز اور نشتریت محسوس نہیں ہوتی جو میر کے اردو کلام کا خاصہ ہے۔ میر نے غالب کی طرح فارسی میں تابہ بینی نقشہائے رنگ رنگ، کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ رواجِ زمانہ کے مطابق معاشرے کی نظر میں اپنا رتبہ بڑھانے کے لئے فارسی میں بھی شاعری کی۔ مصحفی نے لکھا ہے کہ "اگرچہ (ان کا) فارسی دیوان بھی ہے لیکن خود کو فارسی گویوں میں شمار نہیں کرتے"[۱۵۵] آسی نے لکھا ہے کہ "میر صاحب نے یہ دیوان خانہ پوری کے لئے کہا تھا"[۱۵۶] لیکن ہمارا خیال ہے کہ میر نے یہ ایک تجربہ کیا تھا کہ اگر اپنے اردو اشعار اور اپنے مخصوص شعری مزاج کو فارسی میں ڈھالا جائے تو شاید اس کا اثر بھی اردو شاعری جیسا ہو۔ لیکن یہ تجربہ کامیاب نہیں رہا اور انہوں نے دو سال بعد فارسی گوئی ترک کر دی

کلیاتِ اردو

میر کا کلیاتِ اردو چھ دواوین پر مشتمل ہے جن میں غزلوں کے علاوہ بیشتر اصنافِ سخن میں بھی طبع آزمائی کی گئی ہے۔ لیکن اس طرف اب تک کوئی توجہ نہیں دی گئی کہ میر کے یہ دواوین کس زمانے میں مرتب ہوئے۔ ہم ان دواوین کے تعینِ زمانہ کی کوشش کرتے ہیں۔

دیوانِ اول

میر کا دیوانِ اول اپنی ابتدائی صورت میں ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء تک مرتب ہو چکا تھا اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ نکات الشعرا ۱۱۶۵ھ/ ۱۷۵۲ء میں میر نے اپنے ۲۸۴ اشعار کا جو انتخاب دیا ہے اس میں ترتیب کے ساتھ ردیف الف تا یے کے اشعار شامل ہیں۔ یہ وہی دیوان ہے جس کا ۱۲۰۳ھ/ ۸۹-۱۷۸۸ء کا لکھا ہوا مخطوطہ کتب خانہ محمود آباد میں محفوظ ہے اور جسے اکبر حیدری نے مرتب و شائع کر دیا ہے۔ اس دیوان میں "وہ تمام اشعار درج ہیں جو انہوں نے (میر نے اپنے تذکرے (نکات الشعرا) میں بطور انتخاب پیش کئے ہیں"[۱۵۷] اس میں اشعار کی تعداد بھی وہی ہے جو میر کے ذیل میں مردان علی خان مبتلا

نے اپنے تذکرے "گلشنِ سخن" میں دی ہے۔ مبتلا نے میر کا حال ۱۱۹۴ھ/۱۷۸۰ء میں لکھا تھا[۱۵۸] جس کے معنی یہ ہوئے کہ میر کا یہ دیوانِ اول اس زمانے میں بھی مروج تھا اور ۱۲۰۳ھ میں اسی کی نقل میر کے قیامِ لکھنؤ کے زمانے میں تیار ہوئی تھی۔ یہ دیوان دلّی میں مرتب ہوا۔

دیوان دوم

قدرت اللہ شوق کا تذکرہ "طبقات الشعرا" ۱۱۸۹ھ/۱۷۷۵ء میں مکمل ہوا۔ اس میں میر کے دیوان اول و دوم کا انتخاب شامل ہے۔ طبقات الشعرا کے لئے خود میر نے اپنے کلام کا انتخاب بھیجا تھا جیسا کہ "از غزلیات تازہ اوست کہ باین راقم الحروف نوشتہ[۱۵۹]" کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے۔ خود میر کے بھیجے ہوئے اس انتخاب میں بھی دیوان اول و دوم کا کلام شامل ہے۔ میر حسن نے اپنا تذکرہ ۱۱۸۴ھ اور ۱۱۹۲ھ (۱۷۷۰ء اور ۱۷۷۸ء) کے درمیان لکھا۔ اس میں جو انتخابِ کلام دیا ہے اس میں بھی صرف دیوانِ اول و دوم کا کلام شامل ہے۔ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن میں دیوان میر مکتوبہ ۱۱۹۶ھ/ ۸۲-۱۷۸۱ء کا جو مخطوطہ موجود ہے اس میں بھی دیوانِ دوم کی غزلیں ہیں۔"[۱۶۰] پنجاب یونیورسٹی لاہور کے دیوانِ میر کے مخطوطے میں بھی جو ۱۱۹۶ھ کا مکتوبہ ہے' دیوان اول و دوم شامل ہیں۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ دیوان دوم' اپنی ابتدائی صورت میں' ۱۱۸۹ء/۷۶-۱۷۷۵ء تک مرتب ہو چکا تھا اور اس کی نقلیں بھی تیار ہو چکی تھیں۔ یہ دیوان بھی دلّی میں مرتب ہوا۔ اس میں لکھنو کا کوئی ذکر کسی غزل میں نہیں ہے البتہ دلّی کا ذکر کئی اشعار میں ملتا ہے۔

دیوان سوم

مصحفی کا تذکرۂ ہندی ۱۲۰۱ــــ ۱۲۰۹/۱۷۸۶ـ۱۷۹۴ء کے درمیان لکھا گیا۔ یہ تو معلوم نہیں ہوتا کہ میر کا حال مصحفی نے کس سن میں لکھا لیکن اس عبارت سے کہ "چہار دیوانِ ریختۂ او خانۂ فکرش ریختہ" یہ بات ضرور معلوم ہو جاتی ہے کہ ۱۲۰۹ھ/۱۷۹۴ء تک میر کے چار دیوان مرتب ہو چکے تھے۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ۱۲۰۰ھ/۸۶-۱۷۸۵ء تک تیسرا دیوان بھی مرتب ہو چکا تھا

جس میں وہ کلام بھی شامل ہے جو ۱۱۹۶ سے ۱۲۰۰/ ۱۷۸۲-۱۷۸۶ء تک لکھنؤ میں کہا۔ یہ دیوان لکھنؤ میں مرتب ہوا۔ اس میں وہ غزلیں بھی شامل ہیں جو دلّی میں لکھی گئی تھیں۔ دلّی اور لکھنؤ دونوں کا ذکر اس دیوان کی غزلوں میں ملتا ہے:

دل و دلّی دونوں اگرھیں خراب
پہ کچھ لطف اس اجڑے نگر میں بھی ہیں
شعر کچھ میں نے کہے بالوں کی اس یاد میں
سو غزل پڑھتے پھرے ہیں لوگ فیض آباد میں
شفق سے ہیں در و دیوار زرد شام و سحر
ہوا ہے لکھنؤ اس رہ گذر میں پیلی بھیت
دلّی کے لکھنؤ کے خوش اندام خوب لیک
راہِ وفا و مہر ہے مسدود ہر جگہ

دیوان چہارم

جیسا کہ دیوان سوم کے ذیل میں ہم لکھ آئے ہیں مصحفی نے 'تذکرۂ ہندی (۱۲۰۱ــــ ۱۲۰۹/۱۷۸۶ـ۱۷۹۴ء) میں میر کے چار دواوین کا ذکر کیا ہے۔ دیوانِ سوم اگر ۱۲۰۰/۸۶-۱۷۸۵ء تک مرتب ہو چکا تھا تو دیوان چہارم یقیناً ۱۲۰۹/ ۱۷۹۴ء تک یا اس سے پہلے مرتب ہو چکا تھا۔ اکبر حیدری نے بتایا ہے کہ میر کے دیوانِ چہارم کا "ایک نسخہ کتب خانۂ راجہ محمود آباد میں ہے جسے میر کے داماد میر حسن علی تجلی نے لکھا ہے۔ تجلی نے یہ دیوان اپنی وفات ۱۲۱۴/ ۱۷۹۹ء سے بہت پہلے نقل کیا ہے"[۱۶۱] جس سے ہمارے قیاس کو مزید تقویت پہنچتی ہے۔ یہ دیوان لکھنؤ میں مرتب ہوا جیسا کہ ان اشعار سے بھی معلوم ہوتا ہے:

لکھنؤ دلّی سے آیا یاں بھی رہتا ہے اداس
میر کو سرگشتگی نے بے دل و حیراں کیا

خرابہ دلّی کا دہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا
وہیں میں کاش مرجاتا سراسیمہ نہ آتا یاں

دیوان پنجم

تکملۃ الشعرا میں، جو ۱۱۹۷ اور ۱۲۱۳ (۱۷۸۳ء-۱۷۹۸ء) کے درمیان لکھا گیا،[۱۶۲] میر کے پانچ دواوین کا ذکر ملتا ہے۔ شاہ کمال نے بھی ۱۲۱۸ھ/۴-۱۸۰۳ء میں میر کے پانچ دواوین کی اطلاع دی ہے۔[۱۶۳] عمدۂ منتخبہ میں جو ۱۲۱۵ھ اور ۱۲۲۴ھ/ ۱۸۰۰ء اور ۱۸۰۹ء کے درمیان لکھا گیا، میر کے پانچ دواوین ہی کا ذکر ملتا ہے۔[۱۶۴] اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ دیوان پنجم ۱۲۱۳ھ تک یا اس سے کچھ پہلے مرتب ہو چکا تھا۔

دیوان ششم

کلیات میر کے نسخۂ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں میر کے پانچ دواوین یعنی دیوان دوم، سوم، چہارم، پنجم اور ششم شامل ہیں۔ یہ کلیات ۱۲۲۳ھ کا مکتوبہ ہے۔ گویا دیوان ششم اس نسخے کی نقل ۱۲۲۳ھ سے پہلے مرتب ہو چکا تھا۔ یہ بھی لکھنؤ میں مرتب ہوا۔

دیوانچہ

دستور الفصاحت میں لکھا ہے کہ "سہ چہار سال شدہ کہ در لکھنؤ وفات یافت۔ شش دیوان و یک دیوانچہ"[۱۶۵] میر کی وفات ۱۲۲۵ھ/ ۱۸۱۰ء کا واقعہ ہے۔ "سہ چہار سال شدہ" کے الفاظ سے یہ معلوم ہوا کہ میر کا حال زیادہ سے زیادہ ۱۲۲۹ھ/ ۱۴-۱۸۱۳ء میں لکھا گیا۔ اس دیوانچہ میں دیوان ششم کے بعد سے لے کر وفات تک کا کلام شامل تھا۔ یہ نایاب ہے۔

دیوان زادہ

میر کے ایک دیوان دیوان زادہ کا بھی ذکر آتا ہے۔ شاہ کمال نے 'مجمع الانتخاب' میں اس کی صراحت ان الفاظ میں کی ہے کہ "انتخاب دیوانِ پنجم میر صاحب موصوف کہ نام دیوان زادہ نہادہ اند"[۱۶۶] یہ کوئی نیا دیوان نہیں تھا بلکہ دیوان پنجم کا انتخاب تھا جو میر نے کیا تھا۔ یہ بھی نایاب ہے۔

تعینِ زمانہ کی یہ کوشش قطعی نہیں ہے لیکن ہمارے خیال میں اس سے نئے راستے ضرور نکلتے ہیں۔ تعینِ زمانہ سے میر کی شاعری کے مطالعے میں بھی مدد ملتی ہے۔

کلیاتِ میر پہلی بار فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے ۱۸۱۱ء/ ۱۲۲۶ھ میں، میر کی وفات کے ایک سال بعد، اردو ٹائپ میں شائع ہوا۔ اس میں چھ دواوین شامل ہیں۔ قاضی عبدالودود کے مطابق ان دواوین میں تعدادِ اشعار علی الترتیب ۴۲۹۶ + ۳۴۲۱ + ۱۸۳۶ + ۱۵۱۲ + ۲۰۳۷ + ۱۲۳۹ = ۱۴۳۴۱ ہے۔ ان کے علاوہ فردیات مرلع، رباعیات، ترجیع بند، ترکیب بند، مسدس، مخمس، ثلث، مثنویات، ہجویات، ساقی نامہ، قطعات وغیرہ ہیں۔ مثنویوں کے کل ابیات ۳۷۱۰ ہیں۔ اس کلیات میر میں کل ۴۰۲۸۷ مصرعے ہیں۔ اس میں ۱۳۳۱ اشعار مکرر آئے ہیں اور دوسروں کے ۵۱ اشعار فارسی اور ۲ اردو شامل ہیں۔ یہ کلیات میر کے کل اردو اشعار پر حاوی نہیں ہے لیکن اس میں کوئی شعر ایسا نہیں ہے جو میر کا نہیں ہے۔[۱۶۷] آج تک یہی نسخہ کسی نہ کسی صورت میں، سارے مطبوعہ کلیات میر کی بنیاد ہے۔

حالات، سیرت و شخصیت اور تصانیفِ میر کے مطالعے کے بعد اب ہم میر کی شاعری کا مطالعہ کریں گے۔